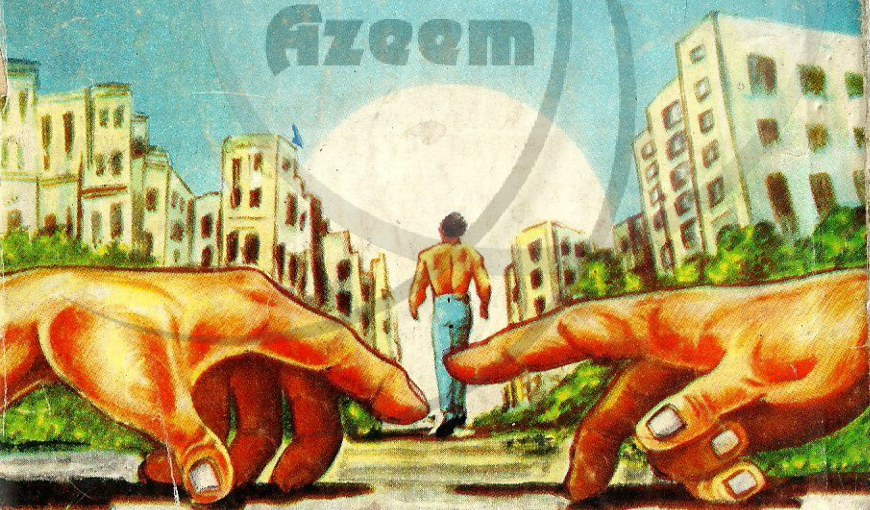
ہاتھ کی تلاش

اشتیاق احمد



دو باتیں

یہ "ہاتھ کی تلاش" ہے، کہانی کے ہر پہر کا آپ کو پتا نہیں چلے گا اور آپ چکر پر چکر کھائیں گے لیکن جان نہ پائیں گے کہ مجرم کون ہے حالانکہ مجرم ہر وقت آپ کی آنکھوں کے سامنے رہے گا اور یہی اس ناول کی خوبی ہے۔ امید ہے پسند آئے گا اور اپنی پسند سے آگاہ کریں گے۔ اس کے ساتھ آپ "کالا شہر" پڑھیں گے جو اپنے نام کی طرح عجیب و غریب ہو گا۔

اشتیاق احمد

ترتیب

ڈنگوبنگو

ایاز ہوٹل کے ہال میں بیٹھے لوگوں میں یکایک خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے سب لوگ کھانے پینے اور گپیں ہانکنے میں مصروف تھے، لیکن اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ کھانا پینا بھول گئے، ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں، منہ دہشت زدہ انداز میں کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

مزے کی بات یہ تھی کہ ہوٹل کے ہال میں پانچ افراد ایسے بھی تھے جو ان خوف زدہ لوگوں کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے، بلکہ انہیں تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ سب لوگ کس چیز سے اس طرح اچانک خوفزدہ ہو گئے ہیں اور یہ محمود، فاروق، فرزانہ، انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید تھے۔

جبرال کے کیس سے فارغ ہونے کے بعد حکومت نے انسپکٹر جمشید کو تھکن اتارنے کے لیے دو ماہ کی چھٹیاں دی تھیں، حالانکہ انسپکٹر جمشید نے بار بار کہا تھا کہ وہ ذرا بھی تھکے ہوئے نہیں ہیں، لیکن افسران نہیں مانے اور انہیں دو ماہ کی چھٹی زبردستی دے دی

گئی۔ اب صلاح یہ ٹھہری کہ ان چھٹیوں کو کیسے گزارا جائے، گھر میں رہ کر تو چھٹیاں گزارنے کا کیا خاک لطف آتا۔ اتفاق سے ان دنوں سکول گرمیوں کی چھٹیوں کے سلسلے میں پہلے ہی بند تھے... اور شہر میں گرمی زوروں پر پڑ رہی تھی۔ ایسے میں ان کے ذہن میں نصیر پور کا خیال آیا۔ یہ ایک چھوٹا سا پہاڑی شہر تھا اور گرمیوں میں یہاں کا درجہ حرارت بھی بہت کم رہتا تھا، اسی لیے گرمی کے مارے لوگ نصیر آباد کی طرف دوڑ پڑتے تھے، لیکن صرف وہ لوگ جن کی جیبوں میں پیسے ہوتے۔ غریب لوگ تو بے چارے نصیر آباد کا نام سن کر ہی سرد آہ بھر کر رہ جاتے، نصیر آباد کے ہوٹل بہت شاندار اور پُر تکلّف تھے لیکن ان میں ایاز ہوٹل کا نام سب سے زیادہ مشہور تھا، روانہ ہونے سے پہلے ہی انہوں نے ایاز ہوٹل میں ٹھہرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ حکومت نے اس کے لیے انہیں ایک خصوصی رقم بھی دی تھی جو انسپکٹر جمشید لینے کے حق میں ہرگز نہیں تھے مگر اس مرتبہ افسروں کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ افسران کا کہنا تھا کہ انہوں نے جبرال کے ہاتھوں ملک اور قوم کو جتنی بڑی مصیبت سے بچایا ہے، اس کا صلہ پوری قوم مل کر بھی نہیں دے سکتی... بلکہ اس کے ساتھ انہوں نے دوسرے اسلامی ملکوں پر نازل ہونے والی مصیبت سے بھی چھٹکارا دلایا تھا اور ان دنوں حال یہ تھا کہ اسلامی ملکوں کے سربراہوں کے شکریے کے

تار انہیں برابر موصول ہو رہے تھے۔ وہ انہیں اپنے اپنے ملک کی سیر کی دعوت بھی دے چکے تھے۔ ہر اسلامی ملک یہ چاہتا تھا کہ وہ ان کے ملک کی سیر کریں۔ تمام اخراجات بھی اس ملک کے ذمے ہوں گے۔ ابھی تک انہوں نے کسی دوسرے ملک جانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ البتہ وہ نصیر آباد ضرور آگئے تھے۔ آنے سے پہلے ان کے لیے نصیر آباد کے ایاز ہوٹل میں ـــــــ دو کمروں کا بھی انتظام کروا لیا گیا تھا۔ ان دنوں اس ہوٹل میں کمرے ملنا محال تھا، لیکن ان کے لیے دو کمرے فوراً ہی مل گئے۔ یہ کام نصیر آباد کے ایس پی احسان علی شوکت کے ذریعے لیا گیا، لیکن انسپکٹر جمشید نے اس سلسلے میں اپنا اور بچوں کا نام نہیں آنے دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے، ملاقاتیوں کا تانتا بندھ جائے۔ ایس پی نصیر آباد کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ہوٹل کے دو کمرے کس کے لیے مخصوص کرائے گئے ہیں، ہوٹل والوں کو صرف یہ ہدایت کی گئی تھی کہ پروفیسر کرمانی آکر کمروں میں رہائش پذیر ہوں گے۔

اور دوسرے دن پروفیسر کرمانی اپنے بچوں کے ساتھ آگئے۔

وہ کل شام ہی یہاں پہنچے تھے، آج کا ناشتا انہوں نے اپنے کمرے میں ہی کیا تھا، لیکن دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ہال میں چلے آئے تھے۔ آج شام سے سیر کا پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ ان کی میز پر کھانا چن دیا گیا اور وہ کھانے کے دوران اِدھر

اُدھر دیکھ رہے تھے۔

"جہاں تک میرا خیال ہے... جیرال سمندر میں ڈوب گیا ہوگا۔"
محمود کہہ رہا تھا۔

"پہلے یہ بتاؤ ـــــ تمہارا خیال ہے کہاں تک۔" فاروق نے شریر لہجے میں کہا۔

"عجیب احمق ہو، یہی تو بتایا ہے۔" محمود نے تنک کر کہا۔

"اگر میں عجیب احمق ہوں تو پھر تم عزیب احمق ہو گے، کیوں کہ عجیب اور عزیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اب تم کہو گے یہ چولی دامن کا ساتھ کیا ہوا، تو اس کا جواب بھی سن لو، یہ محاورہ ہے، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں محاوروں سے چڑ ہے لیکن کیا کیا جائے، گفتگو کے دوران محاورے آ ہی جاتے ہیں، انہیں گفتگو سے نکال کر پھینکا بھی تو نہیں جا سکتا۔ اور اگر ہم ایسا کریں گے تو گفتگو بے ربط ہو جائے گی، اس کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آئے گا اور جس چیز کا مطلب ہی سمجھ میں نہ آئے، وہ فضول ہوتی ہے۔ ہمیں فضول چیزوں سے ذرا بچ کر ہی رہنا چاہیے۔" فاروق رُکے بغیر بولتا چلا گیا۔

"توبہ ہے۔ زبان اس طرح چل رہی ہے جیسے مدّتوں کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملا ہو، حالانکہ یہ سرے سے ہو ہی نہیں سکتا کہ فاروق کی زبان اور خاموش رہے۔" فرزانہ بولی۔

"زبان تو تمہاری بھی کچھ کم نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میری زبان کے مقابلے میں کمزور ثابت ہو۔" فاروق مسکرایا۔

"ہال میں لڑنا نہ شروع کر دینا۔" بیگم جمشید نے بوکھلا کر کہا اور وہ مسکرا دیے۔

"خدا کا شکر ہے۔" محمود بول اُٹھا۔

"یہ شکر کس بات کا ادا کیا ہے۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"یوں تو ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے، لیکن اس وقت میں نے شکر اس بات پر ادا کیا ہے کہ جبرال کے کیس سے فارغ ہوئے ہمیں کئی دن ہو چکے ہیں، یہاں بھی آج دوسرا دن ہے، لیکن ہم کسی معاملے میں نہیں اُلجھے۔ کیا یہ کچھ کم شکر کی بات ہے۔" محمود کہتا چلا گیا۔

"بات تو واقعی بہت شکر کی ہے۔" انسپکٹر جمشید پہلی مرتبہ ان کے درمیان میں بولے۔ "کیا تم نے کبھی نصیر آباد کے شیر شاہ کا نام سنا ہے۔"

"شیر شاہ ـــــ جی نہیں تو۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"ویسے نام تو بہت خوفناک قسم کا ہے۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"تمہیں یاد ہو گا کہ نصیر آباد کا نام سب سے پہلے میں نے لیا تھا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہ... تو... تو کیا آپ جان بوجھ کر اس قصبے میں آئے ہیں اور کیا

یہاں آنے کا آپ کا کوئی خاص مقصد ہے؟" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ ویسے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری سیر میں خلل نہیں پڑے گا۔"

"یہ شبیر شاہ کیا بلا ہے؟"

"نصیر آباد میں آنے والے لوگ اس کے ہاتھ سے محفوظ نہیں رہتے۔ وہ یا تو انہیں اسٹیشن پر ہی لوٹ لیتا ہے، یا شہر میں داخل ہونے کے بعد اور اس وقت بھی اگر موقع نہ ملے تو پھر وہ جہاں جا کر ٹھہرتے ہیں، وہیں ان پر ہاتھ صاف کر دیتا ہے اور اس طرح کوئی بھی اس سے محفوظ نہیں رہتا۔"

"اور شہر میں رہنے والوں کو وہ کچھ نہیں کہتا۔"

"نہیں! صرف سیر کے لیے آنے والوں کو لوٹتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سیر کے لیے آنے والوں کے پاس بڑی بڑی رقمیں ہوتی ہیں اور عورتیں زیورات سے لدی پھندی ہوتی ہیں۔ باقی رہی بات اس قصبے کے لوگوں کی، یہاں زیادہ تر لوگ غریب ہیں۔ لے دے کے یہ چند ہوٹلوں والے دولت مند ہیں، انہوں نے اس سے بچنے کے لیے پہلے ہی انتظام کر رکھا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"مثلاً کیا انتظام کر رکھا ہے؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ظاہر میں تو یہ کہ وہ نقدی اپنے پاس نہیں رکھتے، بینک میں جمع کرا دیتے ہیں، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، وہ ہر مہینے ایک مقررہ رقم

شیر شاہ کو دیتے ہیں۔"

"اوہ ــــ ضرور یہی بات ہو گی۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"تو کیا ابا جان ــــ آپ یہاں شیر شاہ کے لیے آئے ہیں؟"

"شیر شاہ کے متعلق میں بہت عرصے سے سنتا آ رہا ہوں۔ سیر کا پروگرام بننے لگا تو میں نے سوچا، کیوں نہ نصیر آباد چلا جائے، اس طرح ہو سکتا ہے، شیر شاہ کا سامنا ہو جائے اور اس کا کانٹا نکل جائے... اس طرح سیر کے لیے آنے والے لوگوں کو ایک مصیبت سے نجات مل سکتی ہے۔"

"خیال تو نیک ہے... اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چونکہ ہم سیر بھی کرتے رہیں گے، اس لیے ہمیں بالکل کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" فاروق نے کہا۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ فاروق کے منہ سے ایسی بات سنی ہے۔ ورنہ جہاں کسی کیس کا ذکر چھڑا اور اس کی جان ہوا ہوئی۔" محمود بولا۔

"میں نے تو آج تک اس کی جان ہوا ہوتے دیکھی نہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔ "البتہ سٹی گم ہوتے ضرور دیکھی ہے۔"

"اس وقت صورت حال ذرا مختلف ہے۔" فاروق نے شریر لہجے میں کہا۔ "ابا جان شیر شاہ کو ڈھونڈیں گے اور ہم سیر شاہ کو، یعنی سیر کرتے رہیں گے۔"

اور یہی وہ وقت تھا جب یک لخت سارا ہال خاموش ہو گیا

انہیں یہ خاموشی بہت عجیب لگی، چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور وہ حیران رہ گئے۔ ہال میں موجود سب لوگ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو آج یا کل آئے تھے، وہ بھی دوسروں کو خوف زدہ دیکھ کر سہم گئے تھے، البتہ ان کی آنکھوں میں حیرت بھی شامل تھی جب کہ وہ پانچوں صرف حیران تھے، کیونکہ خوف زدہ ہونا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

"یہ لوگوں کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"اس ہوٹل میں سانپ تو خیر آ نہیں سکتا، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ شیر آ گیا ہو، لیکن مجھے یہاں شیر تو کیا شیر کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔" فاروق نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے آنکھوں سے سننے کی کوشش کی ہو گی۔" فرزانہ مسکرائی۔

"تو کیا تم کانوں سے دیکھتی ہو۔" فاروق جھلا کر بولا۔

"سوائے ہم لوگوں کے اور کوئی نہیں بول رہا ہے۔" بیگم جمشید نے گویا انہیں ڈانٹا۔

"تو کیا امی جان آپ چاہتی ہیں، ہم بھی خاموش ہو جائیں۔"

"دیکھو تو سہی۔ معاملہ کیا ہے۔ ہال کے لوگوں کو ہوا کیا ہے۔"

"جی بہت اچھا۔" اس نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔

انہوں نے سب لوگوں کو بغور دیکھا۔ معلوم ہوا، سب لوگ ہال کے دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے بھی دروازے

کی طرف دیکھا اور پھر ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

ہال کے دروازے میں دو ننھے منے آدمی کھڑے تھے۔ ان کے قد مشکل سے چار چار فٹ رہے ہوں گے۔ ان کے ہاتھ بھی خالی تھے اور کولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں، آنکھیں بھی بہت چھوٹی تھیں۔ دونوں کی شکل صورت ملتی جلتی تھی، بہت معمولی فرق تھا۔ بس ایک کا رنگ سانولا تھا۔ اور دوسرے کا ذرا گہرا سانولا۔ شکل صورت سے بھی دونوں بدمعاش ٹائپ نہیں لگتے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک شریفانہ مسکراہٹ تھی۔ کوئی بات بھی تو ایسی نہیں تھی کہ لوگ ان سے خوفزدہ ہوتے، انہوں نے سوچا، شاید ہال میں موجود لوگ ان سے نہیں کسی اور چیز سے خوف زدہ ہیں۔ انہوں نے ایک بار پھر پورے ہال پر نظر دوڑائی، لیکن سب کے سب خوف زدہ انداز میں انہی دونوں کو دیکھ رہے تھے اور اس وقت انہیں یہ یقین کرنا ہی پڑا کہ لوگ ان کے علاوہ کسی سے خوف زدہ نہیں ہیں۔

اب تو ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، کیونکہ ان دونوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ انہیں نظر نہیں آ رہی تھی، ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ انہوں نے ان دونوں کو کاؤنٹر کی طرف بڑھتے دیکھا۔

کاؤنٹر والے کے ہاتھ سے شیشے کا ایک جگ فرش پر گرا

اور چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اس کا پانی فرش پر بہہ گیا اور کرچیاں دُور دُور تک پھیل گئیں۔ کاؤنٹر کلرک تھر تھر کانپنے لگا، اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار طاری ہو گئے۔

"رجسٹر!" ان میں سے ایک نے کرخت آواز میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے کاؤنٹر پر ہاتھ بھی مارا تھا۔ کاؤنٹر پر رکھے گلاس اچھل پڑے اور ان میں سے کئی نیچے گر کر ٹوٹ گئے۔ کچھ اُلٹ کر کاؤنٹر پر ہی لڑھکنے لگے۔

"وہ... وہ... ہوٹل کا مالک... جی ہاں" کاؤنٹر والا بُری طرح ہکلانے لگا۔

"کیا مطلب! ہوٹل کا مالک کیا" دوسرا دھاڑا۔ اگرچہ ان کے سر کاؤنٹر سے ذرا ہی اُونچے تھے، اس کے باوجود سب ان سے خوف زدہ تھے۔

"ہوٹل کا پُرانا مالک ہوٹل بیچ گیا ہے۔ نئے مالک نے رجسٹر اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔"

"کہاں ہے وہ ___؟" پہلا چیخ کر بولا۔

"میں یہاں ہوں میرے دوستو" ایک پُر سکون اور بلند آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

ہوٹل کے ایک کونے سے ایک چھ فٹ لمبا اور چوڑا چکلا نوجوان کاؤنٹر کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ اس کے سامنے وہ دونوں

بالکل بونے نظر آ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

"جب میں نے یہ ہوٹل خریدا تو مجھے تم دونوں کے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔ اس لیے رجسٹر میں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ تین چار دن کے اندر جتنے بھی لوگ ٹھہرنے کے لیے آئے، ان کا نام پتا وغیرہ میں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے لوگوں کی حفاظت کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے، اس لیے پہلے میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ تم ہوٹلوں کے رجسٹر کیوں چھانتے پھرتے ہو۔ نئے ٹھہرنے والے لوگوں کی صورت شکل کیوں دیکھتے ہو، پہلے تم وجہ بتاؤ گے اور پھر میں رجسٹر تم دونوں کو دکھاؤں گا۔"

"ہم نے آج تک وجہ کسی کو بھی نہیں بتائی۔" پہلے نے مسکرا کر کہا۔ اس کی یہ مسکراہٹ حد درجے عجیب تھی۔ لوگوں کو جھرجھری سی آ گئی۔

"اور نہ تمہیں بتائیں گے۔" دوسرے کے منہ سے نکلا۔

"اس صورت میں تمہیں رجسٹر نہیں دکھایا جائے گا۔"

"رجسٹر تو تم خود اپنے ہاتھوں سے ہمارے سامنے پیش کرو گے۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ میں نے تم دونوں کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ کر پولیس کو فون کر دیا تھا۔ وہ آتی ہی ہو گی۔"

"پولیس... ہنہ ـــــ یہ کس چڑیا کا نام ہے۔"

"جب وہ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائے گی تو معلوم ہو جائے گا کہ کس چڑیا کا نام ہے۔" ہوٹل کے مالک نے مسکرا کر کہا۔

"ہم نے آج تک کبھی ہتھکڑیاں نہیں پہنیں۔ پولیس کو اس کی توفیق نہیں ہوئی۔ ویسے دوست تمہارا نام کیا ہے۔" پہلے نے پوچھا۔

"کیوں ـــــ میرا نام کیوں پوچھ رہے ہو۔" ہوٹل کے مالک نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"تم پہلے آدمی ہو، جس نے اس قصبے میں ہمارے سامنے آنے کی جرأت کی ہے۔ تمہارا ذکر ہم ضرور کیا کریں گے، اس لیے نام جاننا ضروری ہے۔"

"اس سے پہلے تمہیں اپنے نام بتانے ہوں گے۔"

"کیوں نہیں، مجھے ڈنگو اور میرے بھائی کو بنگو کہتے ہیں۔ ہم دونوں سگے بھائی ہیں۔ ہم ایک ساتھ جینے اور ایک ساتھ مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اب تم جلدی سے اپنا نام بتاؤ، کیونکہ ابھی ہمیں رجسٹر بھی دیکھنا ہے۔"

"مجھے ارسلان بیگ کہتے ہیں۔ ہوٹل خریدنا اور بیچنا میرا پیشہ ہے اور ہوٹلوں میں آنے والے غنڈوں سے نبٹنا بھی اچھی طرح

جانتا ہوں "

"مگر ہم غنڈے نہیں ہیں"

"میں نے تم دونوں کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور میں تم دونوں کی چٹنی بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں، یقیناً تمہاری چٹنی بہت لذیذ ہو گی۔

"لیکن افسوس تم اسے چکھ نہیں سکو گے" ان الفاظ کے ساتھ ہی ڈنگو گویا ہوا میں اڑتا ہوا ارسلان بیگ کے سر سے ٹکرایا۔ ارسلان کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ دھڑام سے گر پڑا۔ جبکہ بنگو پُرسکون انداز میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ارسلان بیگ فرش پر الیسا گرا کہ پھر نہ اُٹھ سکا، اس کے سر سے بہنے والا خون فرش پر ایک لکیر بناتا ہوا بہنے لگا۔ سب لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈنگو اور بنگو کو دیکھ رہے تھے۔

"اٹھو اور رجسٹر اپنے ہاتھوں سے دکھاؤ" بنگو دھاڑا۔ اس کی دھاڑ سے ہوٹل کا ہال گونج اُٹھا۔

ارسلان بیگ بڑی مشکل سے اُٹھا اور گھسٹتا ہوا اپنی میز کی طرف بڑھنے لگا۔ ادھر اس نے اپنی میز کی دراز میں سے رجسٹر نکالا ادھر ہوٹل کے دروازے سے پولیس اندر داخل ہوئی، لیکن ان دونوں نے پولیس والوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا، ادھر ارسلان بیگ نے جب پولیس کو دیکھا تو اس کے ہاتھ رک گئے۔

پولیس کے آدمی تیزی سے اندر آئے اور پھر ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ انہی قدموں پر رُک گئے۔

"تمہارا ہاتھ کیوں گیا ارسلان بیگ... پولیس کے یہ ٹٹو ہمیں گرفتار کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لائیں گے، اگر فون پر تم نے انہیں ہمارے نام بتا دیے ہوتے تو یہ یہاں تک آنے کی زحمت ہی گوارا نہ کرتے، خیر اب آ ہی گئے ہیں تو بھی تمہارے کسی کام نہیں آ سکیں گے۔ دیکھ لو، وہ وہیں رُک گئے ہیں، جہاں انہوں نے ہمیں دیکھا تھا اور یہ بھی بتا دوں کہ اس وقت تم زندہ صرف اس لیے ہو کہ ہم نے یہ کہہ دیا تھا، تم رجسٹر اپنے ہاتھوں سے ہمیں دکھاؤ گے، اگر ہم نے یہ نہ کہا ہوتا تو اس وقت یہاں تمہاری لاش اٹھانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ اب رجسٹر ادھر کرو۔"

اور ہوٹل کے مالک ارسلان بیگ نے تھر تھر کانپتے ہاتھوں کے ساتھ رجسٹر ان کے آگے رکھ دیا۔ وہ نئے آنے والوں کے نام اور پتے نوٹ کرنے لگے۔ اسی وقت محمود، فاروق اور فرزانہ نے دیکھا، پولیس کے آدمی کھسکتے ہوئے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

یہ معاملہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا... پھر انہوں نے دیکھا، ڈنگو اوپر جا رہا تھا اور بنگو نیچے ہی کھڑا ہال میں موجود لوگوں کو غور

سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید بولے،

"میرا خیال ہے، ہمیں اوپر چلنا چاہیے۔"

"جی ۔۔۔ وہ کیوں؟" محمود چونک کر بولا۔

"اس لیے کہ وہ تمام نئے آنے والوں سے ملیں گے، ان سے کچھ سوالات کریں گے اور اگر نئے آنے والے ہال میں موجود ہوں گے تو پھر ہال میں ہی پوچھ گچھ کریں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہال میں ہی یہ ہماری طرف آئیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب وہ زینے کا رخ کر رہے تھے تو بنگو نے انہیں تیز نظروں سے گھور رہا تھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں کھا جانا چاہتا ہو۔

اسی وقت انہوں نے اوپر سے ڈنگو کو آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا اور وہ اس کاغذ کی طرف دیکھتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔

فرار کا راستہ

اس نے نیچے آ کر کاغذ بنگو کو دیا اور بولا۔

"یہ لوگ نیچے موجود ہیں، انہیں اوپر پہنچنے کے لیے کہہ دو۔"

"اچھی بات ہے۔" بنگو نے کہا اور کاغذ پر لکھے نام پڑھنے لگا۔ ان لوگوں میں پروفیسر کرمانی کا نام بھی شامل تھا۔ جتنے لوگوں کے نام لیے گئے، وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگے۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" ڈنگو نے انسپکٹر جمشید سے پوچھا، کیونکہ اس وقت تک وہ اس کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

"پروفیسر کرمانی!" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"تم اعلان سے پہلے ہی کیوں اٹھ آئے تھے؟"

"ہم لوگ یہاں کل ہی آئے ہیں، کھانے سے فارغ ہو کر اوپر کی طرف چل پڑے، ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تمہاری طرف سے کوئی اس قسم کا اعلان ہونے والا ہے۔"

"خیر تم اوپر چلو، ہم تم سے خصوصی طور پر پوچھ گچھ کریں گے۔"

"اچھی بات ہے"۔ انہوں نے کہا اور دوسری منزل پر آ گئے۔

"بات کچھ پلے نہیں پڑی"۔ محمود بولا۔

"مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ پولیس والوں نے بھی انہیں کچھ نہیں کہا اور واپس چلے گئے۔ آخر یہ چیز کیا ہیں"۔ فرزانہ بولی۔

"یہ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ دونوں تیز طرار حد سے زیادہ ہیں، لیکن پھر بھی اگر ان پر فائر کیا جائے تو وہ مقابلے میں کس طرح ٹھہر سکتے ہیں"۔ فاروق نے کہا۔

"جب یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی تو پھر تم انہیں اچھی طرح جان جاؤ گے"۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی۔ کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"کچھ نہیں۔ آؤ ہم اپنے کمرے میں چلیں تاکہ ان لوگوں کو ہم تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو"۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو کیا آپ ان کے سوالات کے جوابات دیں گے"۔

"ہاں ـــــ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ کیا چیز ہیں، کیا چاہتے ہیں"۔ انہوں نے کہا۔

"کہیں یہ شیر شاہ کے آدمی تو نہیں ہیں"۔ فرزانہ نے سوال کیا۔

"ہرگز نہیں ـــــ شیر شاہ اپنے ساتھ صرف سزا یافتہ آدمیوں کو شامل کرتا ہے۔ یہ اس کا اصول ہے"۔

"کیا ہم اس سے یہ مطلب لیں کہ ہم ایک عدد کیس میں

اُلجھتے جا رہے ہیں" محمود نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ ایک عدد کیس ہمیں اُلجھانے پر تُلا ہوا ہے" فاروق مسکرایا۔

"اگر ایسا ہے تو بھی تم لوگوں کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میں وعدہ کر چکا ہوں کہ ان دنوں تم بڑے مزے سے سیر کر سکو گے" انہوں نے کہا۔

"کہیں یہ دونوں ہمیں سیر کرانے کی ذمے داری خود نہ لے لیں" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہو گا۔ ہم خرچ سے بچ جائیں گے" فرزانہ بول اُٹھی۔

"مجھے ان سوالات کا بڑی بے چینی سے انتظار ہے جو وہ ہم سے کرنا چاہتے ہیں" محمود نے کہا۔

"فکر نہ کرو ـــــ جب وہ آ کر سوال کریں گے، تو میں جواب دینے کا کام تمہارے سپرد کر دوں گا" وہ بولے۔

"کیوں نہ ہم یہاں سے واپس چلیں" فرزانہ بولی۔

"واپس چلیں ـــــ کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"مطلب یہ کہ کسی دوسرے شہر میں چل کر سیر کے پروگرام بناتے ہیں... تاکہ نہ شیر شاہ کی اُلجھن ہو نہ ڈنگو بنگو کی" فرزانہ نے جواب دیا۔

"ان کے نام کتنے عجیب ہیں۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"ناموں سے زیادہ وہ خود عجیب ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"لیکن ہمارا ان سے کیا جھگڑا۔ آخر وہ ہم سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جب وہ پوچھ چکیں گے، تو میں تمہیں بتا دوں گا۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"بے تکی نہ ہانکو۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"اچھا — اب میں تک کی ہانکوں گا۔" فاروق بولا۔

"یہ جواب تم پہلے بھی کئی مرتبہ دے چکے ہو۔" فرزانہ نے گویا یاد دہانی کرائی۔

"شکریہ! میری یادداشت اتنی کمزور نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ تم دونوں خود بھی تو یہ بات پہلے کئی مرتبہ کہہ چکے ہو کہ بے تکی نہ ہانکوں۔ اب میں ہر مرتبہ ایک ہی سوال کا نیا جواب تو دینے سے رہا۔"

"تو پھر خاموش رہو۔ کان کھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔" فرزانہ بولی۔

"جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا۔" فاروق گنگنایا۔

"پہلے آستین پر لہو لگا لو۔" محمود نے جل کر کہا۔

"جونہی کسی کا نکلے گا، میں اسے آستین پر لگا لوں گا۔" فاروق مسکرایا۔

"لاحول ولا قوۃ، کسی کا خون کس طرح پکارے گا۔ تمہاری آستین پر تو خود تمہارا خون ہونا چاہیے۔"

"کیا اُلٹی سیدھی لے بیٹھے ہو۔ کوئی کام بات کرو۔" بیگم جمشید نے اکتا کر کہا۔

"بہت بہتر امی جان۔ کام کی بات یہ ہے کہ آج شام ہم نصیر آباد کی پہاڑیوں کی سیر ضرور کریں گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"اس سے پہلے ان دونوں سے تو نبٹ لو۔" انہوں نے کہا۔

"ہم ان سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہیں۔"

"لیکن مجھے تو وہ بہت خطرناک دکھائی دیتے ہیں۔ اُف توبہ.. اپنے سے دو تین گنا ڈیل ڈول کے آدمی کو اس نے صرف ایک ٹکر مار کر چت کر دیا تھا۔"

"سچ بات تو یہ ہے کہ اس طرح اُچھلنا ہمارے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔" محمود نے کہا۔

"ظاہر ہے، تم اچھل بھی کیسے سکتے ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب... آپ کے یہ جملہ کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ اس کی وجہ جانتے ہیں، وہ کس طرح اچھل سکتے ہیں۔"

"ہاں ——— ہیں...."

ان کے الفاظ درمیان ہی میں رہ گئے۔ اسی وقت ان کے کمرے کا دروازہ زور دار انداز میں کھلا تھا، انہوں نے دیکھا۔ ڈنگو اور بنگو اندر داخل ہو رہے تھے۔



"ہمارے نام ڈنگو اور بنگو ہیں، ہم دونوں سگے بھائی ہیں۔ ہم جس شہر میں بھی جاتے ہیں، وہاں کے لوگ ہمیں دیکھتے ہی تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ یہاں ہمیں آئے ہوئے صرف پندرہ دن ہوئے ہیں، لیکن سارے قصبے کے لوگ ہمیں اچھی طرح جان گئے ہیں۔ تم ابھی کل آئے ہو، لیکن ابھی چند لمحوں بعد اچھی طرح واقف ہو جاؤ گے۔ پہلے صرف اتنا بتاؤ کہ رہنے والے کہاں کے ہو؟"

"جب تک تم دونوں اصل مقصد نہیں بتاؤ گے، ہم تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دیں گے، کیونکہ ہم تو تمہیں جان بھی چکے ہیں، لیکن تم ہمیں قطعاً نہیں جانتے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔ وہ انہیں دیکھ کر اٹھے نہیں تھے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے تھے۔

"ہمیں کسی کو جاننے کی ضرورت نہیں۔" ڈنگو نے کہا۔

"تو پھر یہ کیوں پوچھا ہے کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں؟" محمود نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اس سوال کا جواب تو تمہیں دینا ہی پڑے گا، کیونکہ ہمیں

جس عمر اور شکل صورت کے آدمی کی ضرورت ہے، اس وقت وہ ہمارے سامنے ہے۔" ہنگو نے انسپکٹر جمشید پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا۔" محمود، فاروق اور فرزانہ ایک ساتھ چلّائے۔

"ہاں... ہمیں تلاش ہے ایک ایسے آدمی کی جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو۔ اور اس کا رنگ سرخ اور سفید ہو۔ اور وہ رہنے والا ضلع گورداس پور کا ہو۔"

"فرض کر لو۔ کہ میں گورداس پور کا ہی رہنے والا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"فرض کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر تم گورداس پور کے رہنے والے ہو بھی تو بھی صرف اتنی سی بات سے ہمارا مقصد حل نہیں ہو جاتا۔"

"تمہیں کسی ایسے آدمی سے کیا کام ہے اور تم اسے کیوں تلاش کرتے پھر رہے ہو۔" اچانک محمود نے سوال کیا۔

"ہمیں اس سے بہت ضروری کام ہے۔ اس سے اپنی ایک چیز واپس لینی ہے۔ اسے تلاش کرتے ہمیں بیس سال ہو چکے ہیں۔"

"بیس سال!!" ان سب کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"ہاں! بیس سال سے۔ لیکن آخر ایک دن یہ تلاش ختم ہو جائے گی، وہ ہمیں مل ہی جائے گا۔"

"اگر تم اسے بیس سال سے تلاش کر رہے ہو تو اسے پہچانو گے کیسے،... بیس سال میں تو اس کے چہرے میں نہ جانے کتنی بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی ہو گی۔" فاروق نے کہا۔

"اسے پہچاننے کا ایک خاص طریقہ ہے ـــــ ہمارے پہلے سوال کا جواب مل جانے پر ہم اسے بآسانی پہچان سکتے ہیں۔" ڈنگو نے کہا۔

"اگر تم صاف صاف بتا دو کہ چکر کیا ہے، تو ہم تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہیں۔"

"جب تک ہمیں اصل آدمی نہیں مل جاتا، ہماری زبانیں یہ راز کبھی نہیں اگلیں گی۔" بنگو نے اٹل لہجے میں کہا۔

"پھر ہم بھی تمہارے کسی سوال کا جواب دینے پر مجبور نہیں ہیں۔" جمشید بولے۔

"زبان تو ہم تمہارے فرشتوں کی بھی کھلوا لیں گے۔"

"تو پھر انھی سے معلوم کرتے رہو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

اسی وقت لاؤڈ سپیکر پر ایک آواز سنائی دی۔

"پورے ہوٹل کو گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔ ڈنگو بنگو... آج گرفتاری کے لیے ہم زبردست انتظام کر کے آئے ہیں۔ آج تم دونوں کسی طرح بھی نہیں بچ سکتے۔ لہذا تم دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ تم پر الزام ہے کہ تم

نے سارے قصبے کا امن چین اور سکون لوٹ لیا ہے۔ تم ڈاکو ہو۔ ایک ایسے ڈاکو جس نے لوگوں کو حد درجے خوف زدہ کر رکھا ہے اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر نیچے اتر آؤ اور ہال سے ہوتے ہوئے باہر نکل آؤ۔ اس صورت میں تمہارے ساتھ بہت نرم سلوک کیا جائے گا۔"

لاؤڈ سپیکر پر اعلان ختم ہوا تو دونوں نے بڑا سا منہ بنایا پھر ڈنگو بولا:

"یہ ایس پی کا بچہ پھر آ گیا ہمارے راستے میں، ہم نے اسے کئی مرتبہ خبردار کیا ہے کہ ہمارے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرے، ہم قانون سے ٹکرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ لیکن یہ شخص سنتا ہی نہیں۔ اب اس وقت بھی یہ سو آدمیوں سے تو کیا کم اپنے ساتھ لے کر آیا ہو گا۔ حالانکہ یہ ہماری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا، ہمارے فرشتوں کو بھی گرفتار نہیں کر سکتا۔ آؤ ڈنگو اس وقت چلتے ہیں، کسی وقت پھر اسی کمرے سے ہم اپنا کام دوبارہ شروع کریں گے۔ ابھی میں ان لوگوں کی طرف سے بھی مطمئن نہیں ہوا۔"

"ٹھیک ہے۔ کل دیکھ لیں گے انہیں بھی۔" ڈنگو بولا۔

"ارے مگر تم دونوں فرار کس طرح ہو گے۔ پولیس تو ہوٹل کو

گھیرے میں لے چکی ہے۔" فرزانہ نے گویا انہیں خبردار کیا۔

"ایسے گھیرے تو آئے دن ہمارا مقدر بنتے رہتے ہیں۔" ڈنگو نے لاپروائی سے کہا۔

"بہتر ہے، تم خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ گرفتاری کی نوبت تو ہمارے مرنے کے بعد ہی آئے گی جس روز ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی گئیں، وہ ہماری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

اسی وقت لاؤڈ سپیکر پر دوبارہ آواز سنائی دی اور دونوں تیز تیز قدم اُٹھاتے کمرے سے نکل گئے۔

وہ بھی ان کے پیچھے لپکے، انہوں نے دیکھا، وہ نیچے اُترنے کی بجائے اوپر چڑھ رہے تھے۔ وہ حیران رہ گئے تھے، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اُوپر جانے کی صورت میں تو ان کے بچنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

"کیا ان دونوں کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"نہیں! انہوں نے فرار کا کوئی طریقہ ضرور سوچ رکھا ہے۔" فرزانہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"سوال تو یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟" فاروق بولا۔

"آؤ دیکھیں۔ یہ کیا کرتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اور وہ بھی ان کے پیچھے چلتے ہوئے اُوپر چھت پر آ گئے۔

ڈنگو اور بنگو نے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز سن کر زینے کی طرف دیکھا، وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے، شاید وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہوٹل میں ٹھہرنے والوں میں سے بھی کوئی ان کے پیچھے آسکتا ہے۔

"کیا ارادہ ہے دوستو!" ڈنگو نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ دیکھیں گے، تم کیا کرتے ہو۔"

"کرنا کیا ہے، ہوٹل سے فرار ہو جائیں گے اور پھر کل بتائیں گے اس ایس پی کے بچے کو، جس نے ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑائی ہے۔" بنگو نے برے برے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم فرار کس طرح ہو گے، ہوٹل تین منزلہ ہے اور اس کے ساتھ کسی عمارت کی چھت بھی نہیں ملی ہوئی!" فرزانہ نے چلا کر کہا۔

"چلا کر بات نہ کرو لڑکی۔ کیا تم پولیس والوں کو یہ اطلاع دینا چاہتی ہو کہ ہم چھت پر سے فرار ہونے والے ہیں۔"

"نہیں، میں نے تو اس لیے چلا کر بات کی ہے، کہ میں تمہیں خطرہ مول لیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"تو تم اپنی آنکھیں بند کر لینا۔" ڈنگو ہنسا۔

اسی وقت بنگو نے یہ کہتے ہوئے ہوٹل کی چھت سے چھلانگ لگا دی۔

"آؤ ڈنگو، وقت ضائع نہ کرو۔"

تین منزلہ عمارت سے ایک دوسری عمارت کی چھت پر کسی انسان کو چھلانگ لگاتے انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ یہی نہیں، اس کے بعد انہوں نے اور بھی حیران کن منظر دیکھا، ڈنگو اور بنگو ایک عمارت سے دوسری اور دوسری سے تیسری پر چھلانگیں لگاتے چشم زدن میں بہت دور چلے گئے تھے۔

"پولیس ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتی۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"لیکن ابا جان ــ پولیس ان پر فائرنگ تو کر سکتی ہے۔" محمود نے کہا۔

"ضرور کر سکتی ہے، لیکن اس وقت جب وہ اس کے نشانے کی زد میں آ جائیں۔ پولیس نیچے سڑک پر موجود ہے اور یہ دونوں کہیں کے کہیں جا چکے ہیں۔"

"عجیب ہیں یہ دونوں۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

چھت پر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈنگو اور بنگو ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ کھڑے سوچتے ہی رہ گئے۔ پھر انسپکٹر جمشید کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا تھا:

"میرا خیال ٹھیک ہی تھا۔"

"کیا مطلب... کیا خیال تھا آپ کا ___ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ابا جان!"

"میں نے ان دونوں کو دیکھتے ہی ایک اندازہ لگایا تھا، اب اس اندازے کی تصدیق ہو گئی۔" انہوں نے کہا۔

"ذرا ہم بھی تو سنیں، وہ اندازہ کیا تھا اور اس وقت اس کی تصدیق کس طرح ہو گئی؟" فرزانہ نے بے قراری کے عالم میں کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے جب ہم ہال میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور وہ دونوں..."

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ کچھ لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہے تھے۔

خوفناک کھیل

سب سے پہلے اوپر آنے والا نصیر آباد کا ایس پی احسان علی شوکت تھا۔ اس نے چھت پر کھڑے ان پانچ افراد کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا:

"وہ کہاں گئے؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"چھلانگ لگا کر پہلے اس عمارت پر گئے، پھر اس پر اور پھر اس کے بعد معلوم نہیں کس پر؟" یہ جواب فاروق نے دیا تھا۔ احسان علی شوکت نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، پھر انسپکٹر جمشید کی طرف مڑا۔ ان لوگوں نے یہاں آنے سے پہلے ہلکے قسم کا میک اپ کر لیا تھا۔

"اور آپ لوگ یہاں چھت پر کیا کر رہے ہیں؟"

نیچے زینے پر کوئی بورڈ نہیں لگا ہوا تھا جس پر لکھا ہوتا کہ اوپر چڑھنا منع ہے، اس لیے ہم اوپر چلے آئے... اگر بورڈ لگا ہوتا تو ہم اس کا ضرور احترام کرتے اور کبھی اوپر نہ آتے۔" انسپکٹر جمشید کی بجائے فاروق نے جواب دیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" اس نے جھلا کر انسپکٹر جمشید سے کہا۔ "آپ کے بچے بہت زبان دراز ہیں۔"

"ہاں ——— ان سے یہ شکایت مجھے بھی ہے اور ان کی زبانوں کی لمبائی کم کرنے کے طریقے پر ان دنوں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔" ایس پی غرایا۔

"جی نہیں ——— میں نے انہیں ہمیشہ بڑوں کا ادب کرنے کی تعلیم دی ہے۔ بس کبھی کبھی شوخی پر اتر آتے ہیں۔ محمود فاروق اب ہرگز نہ بولنا۔" انہوں نے دونوں کو ڈانٹا۔

"جی بہت بہتر ابا جان، اب جب تک آپ نہیں کہیں گے، ہم نہیں بولیں گے، کیوں محمود!"

"بالکل ٹھیک ——— ہمیں بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے، جب کہ ہم بولے بغیر بھی خوش رہ سکتے ہیں۔"

"یہ تم دونوں چپ ہوئے ہو؟" فرزانہ نے انہیں گھورا۔

"اور تم کیوں بولی ہو؟" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"مجھے ابا جان نے بولنے سے کب منع کیا ہے؟" فرزانہ نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

"لیجیے ——— یہ آپ کے بچے خاموش ہوئے ہیں۔"

"میں خود بھی ان کی اس عادت سے تنگ ہوں، خاموش ہوتے

ہوتے بھی کئی جملے ان کی زبانوں سے نکل پڑتے ہیں۔ کیا کیا جائے، بچے ہیں۔ اب اتنی سختی بھی تو نہیں کی جا سکتی۔"

"میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟"

"آپ میرا نام جان کر کیا کریں گے؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ نے قانون کے معاملے میں ٹانگ اڑائی ہے۔" ایس پی احسان علی نے کہا۔

"کیا مطلب ——— ہم نے ٹانگ کس طرح اڑائی ہے؟" انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے۔

"ہم یہاں دو مجرموں کو پکڑنے آئے تھے، آپ راستے میں آ گئے۔"

"یہ غلط ہے، دونوں مجرم پہلے ہی فرار ہو چکے تھے، ہم تو ان کے پیچھے اوپر آئے تھے۔"

"آپ ان کے پیچھے کیوں آئے تھے؟" ایس پی نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ چھت کے اوپر سے کس طرح فرار ہو سکتے ہیں۔"

"وہ تو آپ لوگ دیکھ چکے ہیں اور ہمیں بتا بھی چکے ہیں۔ اب آپ صرف اپنا نام بتا دیں اور خدا کے لیے نیچے چلے جائیں" ——— ایس پی احسان علی نے تنگ آ کر کہا۔

"بہت بہتر ——— چلو بچو نیچے چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"پہلے آپ نام بتا دیں کے"۔ ایس پی نے جھلا کر کہا۔

"جی ہاں ــــ کیوں نہیں... میرا نام پروفیسر کرمانی ہے"۔

"پروفیسر کرمانی"۔ ایس پی نے کچھ حیران ہو کر کہا، پھر مارے حیرت کے اچھل پڑا اور بولا

"آپ نے کیا نام بتایا۔ پروفیسر کرمانی"۔

"ہاں ــــ یہی نام بتایا ہے۔ یہ اتنا خوفناک نام تو نہیں ہے"۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ دارالحکومت سے آئے ہیں نا... میں نے ہی آپ کے لیے اس ہوٹل میں کمرے مخصوص کرائے تھے"۔

"کرائے ہوں گے"۔ انسپکٹر جمشید نے بے نیازی سے کہا اور زینے کی طرف مڑ گئے۔

"سنیے ــــ" ایس پی ان کی طرف جھپٹا اور راستے میں آ گیا۔

"افسرانِ بالا نے آپ کے لیے کمرے بُک کرانے کی ہدایات مجھے دی تھیں۔ آپ ضرور کوئی اہم آدمی ہیں۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ کا کیا عہدہ ہے"۔

"میں کوئی اہم آدمی نہیں ہوں۔ کسی نے یونہی لحاظ میں میرے لیے آپ سے کہہ دیا ہو گا۔ آپ اپنا کام کریں، دونوں مجرم کہیں دور نہ نکل جائیں"۔

"اوہ آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔ ایس پی نے کہا اور اپنے آدمیوں

کی طرف مڑ گیا۔

انسپکٹر جمشید اور دوسرے نیچے اترتے چلے گئے۔ اپنے کمرے میں آکر انہوں نے کہا:

"یار میں تم تینوں سے تنگ آگیا ہوں۔"

"جی ۔۔۔ ہم نے کیا کیا ہے؟"

"الٹی سیدھی کیوں شروع کر دی تھیں؟" انہوں نے جھلا کر کہا۔

"پتا نہیں بعض اوقات کیا ہو جاتا ہے.. ہماری زبانیں خود بخود پھسلنے لگتی ہیں۔" فاروق بولا۔

"کسی دن خود نہ پھسل جانا۔"

"اگر کوئی ایسا دن آیا تو ہم جانتے ہیں، آپ سنبھال لیں گے۔"

"تنگ نہ کرو بھائی... میں ان دونوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ارے ہاں ۔۔۔ آج شام سے تو ہم سیر کا پروگرام شروع کر رہے ہیں۔ کیوں نہ آج ہم سرکس دیکھیں۔ اس شہر میں ان دنوں ایک بہت اچھی سرکس بھی تو لگی ہوئی ہے۔"

"جی ۔۔۔ سرکس ۔۔۔" ان کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔ کیونکہ انسپکٹر جمشید کو ایسی چیزوں سے بالکل دلچسپی نہیں تھی اور آج سے پہلے انہوں نے انہیں کبھی سرکس دکھانے کا پروگرام نہیں بنایا تھا۔

"ہاں ۔۔۔ سرکس۔" انہوں نے کہا اور عجیب سے انداز میں

مسکرانے لگے۔



ٹامی سرکس پہاڑیوں کے درمیان لگائی گئی تھی۔ دائیں طرف شو کا ہال تھا اور بائیں طرف سرکس میں کام کرنے والوں کے خیمے تھے اور ان خیموں کے ساتھ ہی سرکس کے جانوروں کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ جن میں شیر، ہاتھی، گھوڑے اور کتے وغیرہ شامل تھے۔ شیروں کو پنجروں میں بند کیا جاتا تھا اور صرف ان کا کھیل دکھانے کے وقت پنجروں سے نکالا جاتا تھا۔ دن میں صرف ایک شو دکھایا جاتا تھا۔ سرکس کے تمام کھیل بہت مقبول تھے۔ اس لیے رش بہت ہوتا۔ سیر کے لیے آنے والے بھی سرکس دیکھنے ضرور آتے۔

آج بھی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ چاروں طرف کرسیاں لگائی گئی تھیں اور درمیان میں کام کرنے والوں کے لیے دائرے کی صورت میں بہت کھلی سی جگہ تھی۔ درمیان میں جال تنا ہوا تھا اور ادھر اُدھر جھولے ٹنگے ہوئے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے شاید ہوٹل سے ہی سرکس کے مینیجر کو فون کر دیا تھا، ورنہ انہیں جگہ نہ ملتی۔ سرکس کے مینیجر کا نام ٹامی تھا۔ وہ ایک انگریز تھا اور اس کی ساری عمر سرکس چلاتے گزر گئی تھی۔

وہ کھیل شروع ہونے سے چند منٹ پہلے ہی پہنچ گئے۔ پورے ہال میں ایک شور مچا تھا، کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، لیکن جونہی پہلا کھیل شروع کیا گیا، ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پہلا کھیل یہ تھا۔ دس آدمی ایک پہیے والی سائیکلوں کو چلاتے ہوئے رنگ کے اندر داخل ہوئے تھے، انہوں نے پورے ہال کا ایک چکر لگایا، پھر کھڑے ہو کر اور لیٹ کر سائیکل چلا، سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اس کے بعد رنگ ماسٹر ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کوڑا تھا۔ اس کا قد چھوٹا سا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں بھی اس نے گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور دوسرے سے وہ کوڑا لہرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو شیر اندر داخل ہوئے۔ شیروں کو دیکھ کر تماشائی سہم گئے۔ شیروں نے ایک زوردار دھاڑ ماری اور پھر رنگ ماسٹر کے آگے آگے چلنے لگے۔ پھر رنگ ماسٹر ان میں سے ایک کی کمر پر سوار ہو گیا اور رنگ کا ایک چکر لگایا۔ اس کے بعد اس نے ایک ٹانگ ایک شیر پر اور دوسری دوسرے شیر پر رکھی اور اس طرح ایک وقت میں دو شیروں پر سواری کر کے دکھائی، اس دوران اس کا بایاں ہاتھ بدستور کوٹ کی جیب میں رہا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے بھی باہر نہ نکلا۔ دو شیروں پر ایک آدمی کا ایک وقت میں سواری کرنا سب

لوگوں کے لیے حیران کن تھا۔ لوگ آنکھیں پھاڑے اس کھیل کو دیکھ رہے تھے۔ کسی وقت بھی شیروں کو غصہ آ سکتا تھا اور وہ رنگ ماسٹر کو چیر پھاڑ کر پھینک سکتے تھے، لیکن ایسا نہیں ہوا، یہ کھیل بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد رنگ ماسٹر ہاتھیوں کو اندر لایا اور انہوں نے اپنی سونڈوں کے ذریعے تماشائیوں کو سلام کیا۔ تماشائی بہت خوش ہوئے، لیکن ابھی سب سے خطرناک کھیل باقی تھا اور سرکس والوں کا اعلان تھا کہ وہ سب سے آخر میں دکھایا جائے گا۔

ہاتھیوں کے بعد چھوٹے چھوٹے قدموں والے تین چار آدمی اُچھلتے کودتے اندر آئے۔ یہ مسخرے تھے، انہوں نے وہ اچھل کود مچائی اور بے ڈھنگی حرکتیں کیں کہ لوگوں کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید سرکس کے کھیلوں کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے اور ان کی محویت محمود، فاروق اور فرزانہ کو حیرت میں ڈال رہی تھی۔ اس طرح مختلف کھیل پیش کیے گئے اور تقریباً اڑھائی گھنٹے گزر گئے۔ آخر آخری اور سب سے خطرناک کھیل کی باری آئی۔ یوں تو اس قسم کے کھیل لوگ بہت مرتبہ دیکھ چکے تھے، لیکن اس میں خوفناک حد تک دلچسپی تھی۔ کھیل کچھ اس طرح شروع ہوا۔ رنگ ماسٹر نے چاروں طرف بندھے رسّوں کے قریب آ کر کہا:

"تماشائیوں میں سے کوئی صاحب دو منٹ کے لیے اندر آ جائیں"

چند سیکنڈ تک کوئی نہ اُٹھا، پھر ایک نوجوان جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رنگ ماسٹر نے ہاتھ میں پکڑی ربڑ کی ایک پٹی لہراتے ہوئے کہا، میں یہ پٹی نوجوان کی آنکھوں پر باندھوں گا، آپ لوگ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ پٹی میں سے کچھ دکھائی تو نہیں دیتا۔ یہ کہہ کر اس نے پٹی باندھی اور کہا، لوگوں کو بتایئے، کچھ نظر تو نہیں آتا۔ اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"بالکل کچھ نظر نہیں آ رہا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب یہ پٹی آپ میری آنکھوں پر پوری طرح کس کر باندھ دیں۔" رنگ ماسٹر نے اس سے کہا۔ نوجوان نے ایسا ہی کیا اور رنگ ماسٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد اس نے تالی بجائی اور دو چھوٹے قدوں والے آدمی اندر آئے۔ یہ بونے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے قد مشکل سے چار چار فٹ تھے۔ ان کے چہروں پر رنگ لگے ہوئے تھے۔ سفید نیلی پیلی اور کالی دھاریاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں بھی ربڑ کی ویسی ہی پٹیاں تھیں۔ انہوں نے نوجوان کی طرف دونوں پٹیاں بڑھا دیں۔

"ان کی آنکھوں پر بھی باندھ دیں۔" رنگ ماسٹر نے کہا اور نوجوان نے ایسا ہی کیا۔

"آپ نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے نا، ہم میں سے کسی کو کچھ نظر تو نہیں آسکتا۔"

"نہیں ـــــ بالکل کچھ نظر نہیں آسکتا۔"

"بہت بہت شکریہ! اب آپ اپنی سیٹ پر تشریف لے جائیں۔" نوجوان رنگ سے نکل کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"حاضرین ـــــ یہ دونوں نوجوان ہر دس سیکنڈ بعد تالی بجائیں گے، میں تالی کی آواز پر خنجر ان پر پھینک کر ماروں گا۔ پٹی کی وجہ سے میں دیکھ نہیں سکتا اور نہ یہ دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا میں اپنی طرف سے انہیں بچانے کی کوئی کوشش نہیں کر سکتا۔ بچنا ان کا کام ہے۔ تالی کی آواز کے ساتھ ہی خنجر ان کی طرف تیر کی طرح جائے گا اور آپ دیکھیں گے کہ بالکل نشانے پر بیٹھے گا، لیکن یہ ان دونوں کی پھرتی ہو گی، جو انہیں خنجروں سے بچائے گی۔ خنجر میری کمر کے گرد بندھی پیٹی میں اڑسے ہوئے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے کوٹ کے بٹن کھول ڈالے اور لوگوں کو خنجروں والی پیٹی صاف نظر آنے لگی۔ اس نے پہلا خنجر نکال کر ہوا میں لہرایا۔ خنجر کی چمک تماشائیوں کی آنکھوں میں لہرا کر رہ گئی۔

"اگر کسی کو یہ شک ہو کہ خنجر نقلی تو نہیں ہیں، وہ اندر آکر خنجروں کا جائزہ لے سکتا ہے۔" رنگ ماسٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں چیک کرنا چاہتا ہوں" ایک ادھیڑ عمر آدمی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ضرور ضرور" رنگ ماسٹر بولا۔

اور اس آدمی نے خنجر دیکھنے کے بعد اس بات کی تصدیق کر دی کہ وہ بالکل اصلی تھے اور نہایت تیز بھی۔ اب کھیل شروع ہوا۔ تمام لوگ مبہوت ہو کر اس کھیل کو دیکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ کانوں میں دور کہیں ڈھول بجنے لگے۔ اتنا جان لیوا کھیل انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ٹامی سرکس مشہور بھی اس کھیل کی وجہ سے تھا۔ یہ تقریباً پچیس سال سے جاری تھا اور نہ جانے کتنی دولت کما چکا تھا۔ اس کے پاس دولت کا کوئی شمار نہیں تھا۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر رنگ ماسٹر اور اس کے دو ساتھی یہ کھیل نہ دکھائیں تو سرکس دو دن بھی نہ چلے اور ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رنگ ماسٹر اور ان دونوں چھوٹے قد والوں کی بڑی عزت کرتا تھا اور انہیں تنخواہ بھی بے شمار دیتا تھا۔ وہ بھی مدتوں سے یہ کھیل دکھا رہے تھے۔ ذرا چوک ہو جانے پر جان جا سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ سرکس اور اس کے مینیجر کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے۔ ٹامی بھی ان پر جان چھڑکتا تھا۔

آخر رنگ ماسٹر نے پہلا خنجر پیٹی سے نکالا اور ان کی تالی کے

انتظار میں اسے نوک سے پکڑ کر تولنے لگا۔ پھر جونہی انہوں نے تالی بجائی، اس نے ان پر کھچ سے خنجر کھینچ مارا، دونوں بجلی کی سی تیزی سے اچھلے اور خنجر ان کے نیچے سے نکل کر چاروں طرف دیوار کی صورت لگی رسّی کی جالیوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اگر یہ جالیاں نہ لگی ہوتیں تو خنجر کسی تماشائی کے جا لگتا۔ پہلا خنجر چھوڑتے ہی اس نے دوسرا نکال لیا، ساتھ ہی انہوں نے تالی بجائی، خنجر ایک بار پھر سنسناتا ہوا ان کی طرف چلا، اس مرتبہ وہ اچھلے نہیں، بلکہ دائیں بائیں گر پڑے۔ خنجر ان کے درمیان سے نکل کر رسیوں میں اُلجھ گیا، اس مرتبہ تماشائی رہ نہ سکے، بے تحاشا تالیاں بجانے لگے۔

تیسرا خنجر نکلتے ہی تالیوں کی آواز یک دم رُک گئی۔ لوگ سانس روک کر بیٹھ گئے۔ اس مرتبہ کا کھیل اور بھی خطرناک تھا۔ دونوں چھوٹے قد والے ایک دوسرے کی کمر سے کمر ملا کر کھڑے ہو گئے، پھر انہوں نے تالیاں بجانے کے لیے ہاتھ اٹھائے، پورے ہال میں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ اب اگر اتفاق سے خنجر ان کے لگ جاتا تو دونوں کے جسموں کے آر پار ہو جاتا۔ اس سے پہلے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے تھے، اس طرح کہ درمیان میں ایک آدھ انچ کا فاصلہ تھا۔

تالی کی آواز کے ساتھ ہی خنجر کی چمک لہرائی۔ دونوں ہوا میں اچھلے اور دھم سے دوسری طرف گرے۔ ایک بار پھر ہال تالیوں

سے گونج اٹھا۔ یہ سلسلہ کوئی پانچ منٹ تک جاری رہا، پھر اچانک ان دونوں کے منہ سے چیخ نکلی، وہ دونوں ایک ساتھ گرے تھے اور خنجر ان دونوں کے درمیان سے نکلتا چلا گیا تھا، لیکن چونکہ دونوں کے درمیان ایک انچ سے بھی کم فاصلہ تھا اس لیے وہ ان کے پہلوؤں کو کاٹتا چلا گیا۔

اور یہ اس لیے ہوا تھا کہ تالی بجنے سے صرف ایک سیکنڈ پہلے ہال میں سے کسی نے تالی بجا دی تھی۔ چیخ کی آواز کے ساتھ ہی ہال میں ہل چل مچ گئی، لوگ سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آؤ ہم چلتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے ان سے کہا اور اٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دیکھا، دروازے میں سے بہت سے آدمی نکل رہے تھے۔

"وہ ضرور ان میں شامل ہو کر نکل گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"کون؟" انہوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"وہ جس نے تالی بجائی تھی، اس نے تالی سوچے سمجھے بغیر نہیں بجائی تھی۔ وہ چاہتا تھا، خنجر ان دونوں کو ختم کر دے، لیکن ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہ صرف زخمی ہو سکے۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

یہ معاملہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ کیا ان

کے والد انہیں سرکس دکھانے کچھ سوچ سمجھ کر لائے تھے۔ آخر وہ کون تھا جس نے تالی بجائی تھی۔ اسے ان دونوں سے کیا دشمنی تھی۔ دروازے سے باہر نکل کر جب وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھے تو انسپکٹر جمشید بولے،

"میں کچھ سوچ کر ہی تمہیں سرکس دکھانے لایا تھا۔ کیا سوچ کر لایا تھا، یہ تم تینوں مجھے بتاؤ گے۔"

"جی ___ کیا مطلب۔" تینوں چونکے۔

"مطلب ہی تو تم سے پوچھا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ ہم سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ہمیں سرکس کس لیے دکھائی ہے۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں!" انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن ابا جان ___ ہم یہ بات کیسے بتا سکتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"کیوں ___ کیا تمہارے پاس عقلیں نہیں ہیں۔"

"جی ___ وہ تو ہیں۔" فرزانہ بول پڑی۔

"تو پھر ان سے کام لو۔ جب سے ہم نصیر آباد آئے ہیں، اس وقت سے اب تک کے حالات کا جائزہ لو، ساری بات خود بخود تمہاری سمجھ میں آ جائے گی اور تم پکار اٹھو گے، ہم سمجھ گئے... آپ ہمیں یہاں کیوں لائے تھے۔"

"اوہ !" ان کی آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
وہ سوچ میں ڈوب گئے۔

جھڑپ ہو گئی

وہ کتنی ہی دیر اسی طرح سوچ بچار میں گم رہے، یہاں تک کہ ٹیکسی ابا کے ہوٹل کے سامنے رک گئی اور انہیں پتا بھی نہ چلا۔

"اترو بھئی ــــ کیا سو گئے، میں نے سوچنے کے لیے اور عقل استعمال کرنے کے لیے کہا تھا، نہ کہ سونے کے لیے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا اور وہ چونک اٹھے۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔

"سچ بات تو یہ ہے ابا جان کہ ابھی تک میرے پلے تو کچھ پڑا نہیں۔" فاروق نے کہا۔

"تمہارے پلے آج تک کچھ پڑا بھی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں... بہت کچھ پڑا ہے۔ کم از کم میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہوٹل میں جو کچھ ہم نے دیکھا تھا، اس کا تعلق سرکس کے واقعے سے ضرور ہے، کیا تعلق ہے، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔"

"یہ تو وہ بھی سمجھ سکتا ہے جس کے پاس ایک ماشہ عقل ہے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"تو کیا عقلیں اللہ تعالیٰ نے تول کر تقسیم کی ہیں"۔ فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مذاق چھوڑو ——— اس وقت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے"۔ فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"اگر تم کچھ سمجھ گئی ہو تو ہم سننے کے لیے تیار ہیں"۔ فاروق بولا۔

"ہاں! میں کچھ کچھ سمجھ گئی ہوں"۔ فرزانہ مسکرائی۔

"اس کا مطلب ہے، ابھی کچھ کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہے"۔ فاروق نے کہا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے"۔

"چلو خیر ——— جتنا کچھ سمجھ گئی ہو، بتا دو۔ باقی محمود بتا دے گا"۔ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"اور تم کیا کرو گے"۔ فرزانہ نے جل کر کہا۔

"میں غور سے سنوں گا اور فخر محسوس کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتنے عقل مند بھائی بہن دیے ہیں"۔

"کاش اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی عقل مند بھائی دیا ہوتا"۔ محمود نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"تو کیا میں بے وقوف ہوں"۔ فاروق نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"یہ ہم نے کب کہا"۔ محمود مسکرایا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ سمجھ لوں گا تم سے۔"

"کیا سمجھ لو گے، یہ بھی بتا دو۔ تاکہ ہم سمجھانے کی تیاری کر لیں۔"

"میرا خیال ہے، تم تینوں فضول کی بحث میں اُلجھ گئے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"یہ فضول کی بحث میں اُلجھتے کب نہیں۔" بیگم جمشید نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"ہاں تو فرزانہ تم کیا سمجھ گئی ہو۔"

"ابا جان! آج دوپہر کے وقت ڈنگو اور بنگو ہوٹل کے ہال میں داخل ہوئے تھے۔ ہم نے ان کے کام اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ چھت پر چڑھ کر یہ بھی دیکھا کہ کس طرح انھوں نے ایک عمارت سے دوسری عمارت پر چھلانگیں لگائی تھیں، اب میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ سرکس میں جن دو چھوٹے قد والوں کو ہم نے خنجروں سے بچتے دیکھا ہے، وہ ڈنگو اور بنگو ہی تھے۔"

"کیا!!" محمود، فاروق اور بیگم جمشید ایک ساتھ چلائیں۔

"ہاں! جب رنگ میں خنجر مارتا تھا تو وہ بالکل اسی طرح اچھلتے تھے جس طرح ان میں سے ایک نے اچھل کر ہوٹل کے مالک ارسلان بیگ کو ٹکر ماری تھی۔ ان کے قد بھی بالکل اتنے ہی تھے اور اگر اس وقت ان کے چہروں پر رنگین دھاریاں نہ ہوتیں تو ہم فوراً ہی انھیں پہچان لیتے۔"

"بہت خوب فرزانہ ـــ تم نے کمال کر دیا۔ دراصل ہوٹل میں ان دونوں کو دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ دونوں ضرور کسی سرکس میں کام کرتے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ اسٹیشن سے ہوٹل کی طرف آتے ہوئے میں نے سرکس کے بورڈ جگہ جگہ لٹکے ہوئے تھے۔ بس میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ سرکس دیکھیں گے اور اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ وہ دونوں ڈنگو اور بنگو ہی تھے، بلکہ اب تو میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ جس نے آج ہال میں تالی بجائی ہے، وہ شہر میں اس کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

"اوہ!" وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

"اب ہمیں دو کام کرنے ہیں۔ پہلے تو ایس پی نصیر آباد کو ان دونوں سے بچانا ہے اور اس کے بعد سرکس کے مالک سے جا کر ملنا ہے۔ میں اس سے چند سوال کروں گا۔"

"لیکن وہ آپ کے سوالوں کے جواب کیوں دینے لگا، ظاہر ہے کہ آپ سرکاری حیثیت میں نہیں جائیں گے۔ یوں بھی آپ ان دنوں چھٹی پر ہیں اور میک اپ میں بھی ہیں۔" محمود نے اعتراض کیا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے اس کا طریقہ سوچ لیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کیا آپ ہمیں نہیں بتائیں گے کہ کیا سوچ لیا ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"کل صبح تم خود ہی دیکھ لو گے۔" انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا اور مسکرانے لگے۔

اور وہ سوچتے ہی رہ گئے کہ وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔



دوسرے دن وہ صبح سویرے ہی ایس پی نصیر آباد کے گھر جا پہنچے، اس کا گھر پولیس چوکی کے پاس ہی تھا۔ انہیں تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ ہوا میں خنکی تھی اور موسم گرما میں خنک ہوا بہت فرحت بخش لگتی ہے، اس لیے وہ تینوں خوب چہک رہے تھے۔ دروازے کی گھنٹی کا بٹن دبانے پر ایک ملازم نے دروازہ کھولا۔ یہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ آنکھوں پر نظر کی عینک لگی تھی۔

"ہمیں ایس پی صاحب سے ملنا ہے۔"

"وہ ناشتے کی میز پر بیٹھے ہیں اور اس وقت کسی سے ملنا پسند نہیں کریں گے۔"

"ان سے جا کر کہو، پروفیسر کرمانی ان سے ملنے آئے ہیں اور اگر یہ نام سن کر بھی ان کے کان پر جوں نہ رینگے تو ان سے کہہ دینا کہ ڈنگو اور بنگو کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ پھر دیکھنا وہ کس طرح دوڑے آتے ہیں۔"

"لیکن جناب! ان کا حکم ہے کہ جب وہ ناشتا کر رہے ہوں تو

ان تک کسی کا پیغام پہنچایا ہی نہ جائے۔" ملازم نے جز بز ہو کر کہا۔

"تم جاؤ ــــ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ تم پر ناراض نہیں ہوں گے"۔

"مجھے افسوس ہے جناب ــــ ناشتا ختم ہونے سے پہلے میں آپ کا پیغام نہیں پہنچا سکتا۔"

"کیا تمہیں اپنے آقا کی زندگی عزیز نہیں"۔ انسپکٹر جمشید نے تنگ آ کر کہا۔

"کیوں نہیں۔ میں ان پر اپنی جان نثار کر سکتا ہوں"

"تو پھر سنو۔ اگر تم نے ہمارا پیغام انہیں نہ دیا تو ان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ ہو سکتا ہے، پڑ بھی چکی ہو کیونکہ تم پہلے ہی بہت دیر کر چکے ہو۔"

اسی وقت ایک ٹیکسی ایس پی صاحب کے گھر کے سامنے آ کر رکی اور اس میں سے ڈنگو اور بنگو اترتے نظر آئے۔

"اوہ ــــ ابا جان وہ تو آ بھی گئے جن سے آپ ایس پی صاحب کو بچانا چاہتے ہیں"۔ فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"محمود، فاروق ــــ تم دونوں اس احمق ملازم کو دھکیل کر اندر گھس جاؤ اور ایس پی صاحب کو خبردار کر دو۔ میں ان دونوں کو روکنے کی کوشش کرتا ہوں"۔ انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا۔ ملازم ان کا لہجہ سن کر گھبرا گیا اور اندر کی طرف دوڑا۔ محمود اور فاروق

اس کے پیچھے دوڑے اور انسپکٹر جمشید فرزانہ کی انگلی پکڑ کر ان کی طرف مڑے۔ دونوں ایک ایک قدم اٹھا کر ان کی طرف بڑھنے لگے۔
جونہی ان کی نظر انسپکٹر جمشید اور فرزانہ پر پڑی، وہ زور سے چونکے:

"تم دونوں یہاں اور ہاں، کل تو تم پانچ عدد تھے، آج دو کیسے رہ گئے۔" ڈنگو کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہمیں ایس پی صاحب سے کچھ کام تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں! تو تم اس سے یہ کہنے آئے تھے کہ آج ہم اس سے نبٹنے آ رہے ہیں۔" بنگو نے انہیں گھورا۔

"تم دونوں تو بہت شریف آدمی نظر آتے ہو، ایسے تو نہیں لگتے کہ کسی کو نقصان پہنچا سکو۔" انسپکٹر جمشید نے انہیں باتوں میں لگانے کے لیے کہا۔

"ہم اپنے راستے میں آنے والی ہر دیوار کو گرا دیتے ہیں۔ ایس پی اس سے پہلے بھی ہمیں گھیرنے کی کوشش کر چکا ہے۔" ڈنگو نے کہا۔

"یہ اس کا فرض ہے۔ وہ فرض کے ہاتھوں مجبور ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"اور ہم اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور ہیں۔"

"تمہارا فرض کیا ہے، ذرا میں بھی تو سنوں۔"

"تم ہو کون؟" بنگو نے انہیں پھر گھورا۔

"مجھے پروفیسر کرمانی کہتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ تو ہم جانتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے کام سے کام رکھو، ہمارے کسی معاملے میں ٹانگ نہ اُڑاؤ، ورنہ پچھتاؤ گے؟"

"میں اپنے کام سے کام ہی تو رکھ رہا ہوں"۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"عجیب ضدی آدمی ہو، ہمیں جانتے ہو اور پھر بھی راستہ روکے کھڑے ہو، ہٹ جاؤ ہمارے راستے سے"۔

"تم ایس پی صاحب سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟" انہوں نے پُرسکون آواز میں پوچھا۔

"اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔

"میرے ہوتے ہوئے تم ایسا نہیں کر سکتے"۔ انسپکٹر جمشید بھرپور انداز میں مسکرائے اور فرزانہ کا ہاتھ اپنی جیب میں رینگ گیا۔ دوسرے ہی لمحے گڑیا اس کے ہاتھ میں نظر آئی۔

"کیا کہا۔ تم اور ہمیں ایسا کرنے سے روکو گے، شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، شہر کا شہر ہم سے تھر تھر کانپتا ہے اور تم کہتے ہو کہ ہمیں ایسا کرنے سے روک سکتے ہو؟"

"میری تو کیا بات کرتے ہو، تمہیں تو میری یہ بچّی روک سکتی

ہے۔" انہوں نے کہا۔

ڈنگو اور ہنگو ایک دم فرزانہ کی طرف مڑے اور پھر اس کے ہاتھوں میں گڑیا دیکھ کر ہنسنے لگے۔ وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ فرزانہ نے سوچا، موقع مناسب ہے، اس نے ہاتھ آگے کر کے گڑیا کا پیٹ دبا دیا اور ساتھ ہی گڑیا کو نیم دائرے کی صورت میں حرکت بھی دی تھی۔ اس سے یہ ہوا کہ گڑیا کے پیٹ سے نکلنے والی دھار سیدھی پڑنے کی بجائے ترچھی پڑی اور وہ دونوں اس کی لپیٹ میں آ گئے، وہ پہلے ہی بے خبر تھے، پٹ سے گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے انہوں نے دونوں کی آنکھوں میں بلا کی حیرت دیکھی۔

پھر وہ دروازہ کھول کر ایس پی صاحب کے گھر میں داخل ہو گئے۔ سامنے ہی محمود اور فاروق کھڑے تھے۔ محمود بولا:

"ایس پی صاحب کمرے میں بند ہو گئے ہیں۔"

"ان سے کہو، ان کے دونوں مجرم باہر بے ہوش پڑے ہیں۔ باہر نکل کر انہیں اٹھوا لیں۔"

یہ آواز ایس پی کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور انسپکٹر جمشید کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"آپ... آپ تو وہی ہیں۔"

"ہاں۔ ڈنگو اور ہنگو کے خطرناک ارادے کی خبر ہم آپ کو دینے

آئے تھے، لیکن آپ کے ملازم نے آپ کو اطلاع دینے سے انکار کر دیا، اتنے میں وہ دونوں آدھمکے، اس لیے ہمیں ان کا بندوبست باہر ہی کرنا پڑا۔"

"لیکن کیسے۔ آپ نے ان دونوں کو کس طرح بے ہوش کیا؟" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"یہ کام میں نے نہیں... میری بچی نے کیا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"کیا!!" وہ چیخ اُٹھا۔

"جی ہاں — اگر آپ اسی طرح باتیں کرتے رہے تو وہ دونوں فرار ہو جائیں گے۔"

"اوہ ہاں — میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پاس ہی تپائی پر رکھے فون پر جھک پڑا اور اپنے ماتحتوں کو ہدایت دینے لگا۔ اس کے بعد ان سے بولا:

"تشریف رکھیے۔"

"مجھے ڈر ہے، آپ کے ماتحت ان کی طرف خاص توجہ نہیں دیں گے اور وہ فرار ہو جائیں گے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ وہ اب کہیں نہیں جا سکتے۔ اب یہ فرمایئے کہ آپ کون ہیں؟"

"میں شاید کل آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرا نام پروفیسر کرمانی ہے۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں، لیکن سوال تو یہ ہے کہ آپ کی لڑکی نے ان

دونوں کو بے ہوش کس طرح کر دیا۔"

"یہ میری بیٹی کا کمال ہے، اس بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"بہرحال میں آپ کا حد درجے شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے ان دونوں سے بچایا، ورنہ ان سے بچنا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ آپ کو کیا بتاؤں میں اس عہدے کے قابل ہوں ہی نہیں، بس سفارشی بھرتی ہو گیا تھا اور پھر ہر موقعے پر سفارش مجھے ترقی دلواتی چلی گئی۔ ایک وزیر میرے قریبی عزیز تھے۔" ایس پی نے صاف صاف لفظوں میں انہیں بتایا۔

"خیر کوئی بات نہیں، اب تو آپ ایس پی بن ہی چکے ہیں، اب اس کیس میں آپ کی مدد میں کروں گا۔ پہلے تو یہ معلوم کریں کہ ان دونوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا ہے یا نہیں، اگر نہیں تو پہلے ان کا بندوبست کرا دیجئے، پھر ہم ان سے چند سوال کریں گے اور اس کے بعد میں آپ کو ایک جگہ لے چلوں گا، اس کیس کے سرپیر کا اگر پتا چلا تو وہیں سے چلے گا۔"

"اوہ! آپ کا مطلب کس کیس سے ہے؟"

"یہ جو ڈنگو اور بنگو کسی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ... پروفیسر صاحب، آپ تو مجھ سے زیادہ پولیس والے نظر آتے ہیں۔"

"دراصل بات یہ ہے کہ میں جاسوسی کہانیاں پڑھتا رہتا ہوں"۔
انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اور شاید آپ کے بچے بھی جاسوسی کہانیاں بہت پڑھتے ہیں"۔
ایس پی احسان علی شوکت نے کہا اور انسپکٹر جمشید اسے چونک کر دیکھنے لگے۔ وہ یہ جملہ کہنے کے بعد فون پر جھک گیا تھا۔ اسے پولیس چوکی سے کسی سے بات کرنے کے لیے نمبر نہیں گھمانے پڑتے تھے۔ ایک بٹن دباتے ہی چوکی کے فون کی گھنٹی بجنے لگتی تھی۔

"ہیلو کمال خان ـــــ ان دونوں کو پکڑ کر بند کر دیا یا نہیں"۔

"جی ابھی نہیں ـــــ رمضان اور منیر انہیں لینے گئے تھے، ابھی تک نہیں لوٹے"۔

"تو پھر تم خود جا کر دیکھو، وہ کہاں رہ گئے ہیں"۔ اس نے کہا۔

"جی بہت اچھا"۔

احسان علی شوکت نے ریسیور رکھ دیا، لیکن فوراً ہی گھنٹی بجی اور دوسری طرف سے کمال خان نے کہا:

"ہیلو ـــــ رمضان اور منیر بے ہوش پڑے ہیں اور وہ دونوں غائب ہیں"۔

"کیا کہا ـــــ وہ دونوں غائب ہیں"۔ ایس پی حلق پھاڑ کر بولا۔

اور وہ چاروں بھی اچھل پڑے۔ گڑیا کے دھوئیں سے بے ہوش ہونے والے اتنی جلدی تو ہوش میں نہیں آتے تھے۔ یہ بات ان کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھی۔

شیر شاہ

چند لمحوں کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ ان کے چہروں پر حیرت کے آثار تھے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی آدمی گڑ بڑ کے دھوئیں سے بے ہوش ہو جائے اور اتنی جلدی ہوش میں آ جائے، دوسری طرف ایس پی کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اسے شاید یہ خیال تھا کہ اب ڈنگو اور بنگو اسے ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔

"اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو فوراً ٹامی سرکس کے مالک سے مل لیں، بلکہ ابھی اور اسی وقت ملاقات کر لیں گے تو یہ اور بھی آپ کے حق میں بہتر رہے گا۔"

"لیکن میں اس سے بات کیا کروں گا، مجھے تو اس معاملے کے سر پیر کا پتا ہی نہیں ہے۔"

"چلیے! ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" انہوں نے کہا۔ "آپ چل کر جیپ میں بیٹھیے، میں ابھی آتا ہوں۔"

"بہت اچھا۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کر باہر آ گئے۔

جلد ہی وہ پولیس کی جیپ میں بیٹھ کر سرکس کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"کیا ٹامی نے کل رات کوئی رپورٹ لکھوائی ہے؟"

"آپ کا مطلب سرکس کے مالک سے ہے؟"

"جی ہاں ـــــ میرا خیال ہے، کل اس نے کوئی رپورٹ لکھوائی ہو گی۔"

"کیوں ـــــ اسے کیا ہوا۔؟" ایس پی نے پوچھا۔

"کل اس کے سرکس میں ہنگامہ سا ہو گیا تھا، اس کے دو ملازم زخمی ہو گئے تھے۔"

"اچھا اچھا، میں سمجھ گیا۔ اس واقعے کی تفصیل میرے ایک کانسٹیبل نے مجھ تک پہنچائی تھی، لیکن ٹامی نے کوئی رپورٹ ہی نہیں لکھوائی، ظاہر ہے ہم اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتے جب تک کوئی رپورٹ نہ لکھوائے۔"

"ہوں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"سرکس کے مالک سے بات کیا کرنی ہے، کچھ مجھے بھی تو بتا دیں۔"

"پہلے تو یہی پوچھیں گے کہ اس نے رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی اور پھر کچھ اور سوال بھی کریں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں تو زیادہ تر خاموش ہی رہوں گا۔ آپ ہی

باتیں کیجیے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔"

جلد ہی وہ سرکس تک پہنچ گئے۔ سرکس کا ایک ملازم انہیں ٹامی کے خیمے تک لے گیا۔ صبح کا وقت تھا، سب لوگ ناشتا وغیرہ کرنے میں مصروف تھے۔ جانور بھی چارہ کھانے میں مشغول تھے۔ ٹامی کے خیمے میں اس وقت رنگ ماسٹر بھی تھا، انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"آیئے آیئے... ایس پی صاحب!" ٹامی نے خوش ہو کر کہا۔

"ہم کل والے واقعے کی تفصیل معلوم کرنے آئے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کل کیا ہوا تھا اور آپ نے اس کی رپورٹ کیوں درج نہیں کرائی۔"

"آپ تشریف تو رکھیے۔"

وہ سب خیمے میں بچھی میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ٹامی نے کہا:

"کل کسی نے ہال میں تالی بجا دی تھی، رنگ ماسٹر کا ہاتھ ایک سیکنڈ پہلے چل گیا اور اتنی ہی دیر ان دونوں کو اپنا بچاؤ کرنے میں لگ گئی۔ اس طرح وہ معمولی سا زخمی ہو گئے۔ اگر اس نامعلوم آدمی نے یہ حرکت اس وقت کی ہوتی جب وہ دونوں کمر سے کمر ملا کر کھڑے ہوئے تھے تو ان دونوں کا خاتمہ لازمی تھا۔" اس

نے بتایا۔

"آپ کو اس نامعلوم آدمی کے خلاف رپورٹ تو لکھوانی چاہیے تھی"۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

"بس میں نے سوچا، اب اسے کس طرح تلاش کیا جا سکے گا"۔ ٹامی نے کہا۔

"یہ سوچنا پولیس کا کام تھا"۔

"خیر چھوڑیے۔ آپ ذرا ان دونوں کو بلوائیے، ہم ان سے بھی چند سوال کرنا چاہتے ہیں"۔

"اوہ اچھا"۔ یہ کہہ کر اس نے تالی بجانے کے لیے ہاتھ اُٹھائے لیکن پھر کسی خیال سے رُک گیا اور بولا:

"مسٹر حکیم... ذرا تم ہی ان دونوں کو بلا لاؤ"۔ اس نے یہ جملہ رنگ ماسٹر سے کہا تھا۔

"جی اچھا"۔ رنگ ماسٹر فوراً اٹھ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چھوٹے قد والے دو آدمیوں کو لے کر اندر داخل ہوا، ان کے چہروں پر رنگین دھاریاں بنی تھیں۔

"تم دونوں کے نام کیا ہیں"۔ انسپکٹر جمشید نے سوال کیا۔

"مجھے ٹیرا کہتے ہیں اور اس کا نام طاؤس ہے"۔

"یہ ٹیرا کیسا نام ہوا، ذہن میں ٹیرا ڈبہ کا نام آتا ہے"۔ فاروق بولا۔

"کیا کیا جائے، بچپن کا یہی نام ہے اور مجھے پسند بھی ہے"۔

اس نے کہا۔

"اچھا تو ٹیرا صاحب ـــــ اگر میں تم دونوں پر آنکھیں بند کر کے نالی کی آواز پر خنجر چلاؤں تو کیا تم پھر بھی بچ جاؤ گے، یا تم صرف رنگ ماسٹر کے خنجروں سے ہی بچ سکتے ہیں۔"

"جی نہیں ـــــ بچنے کو تو ہم ہر ایک کے وار سے بچ سکتے ہیں۔"

"تو پھر کل تم زخمی کیوں ہو گئے تھے۔"

"ہم اس کے لیے تیار نہیں تھے، آواز بالکل مخالف سمت سے آئی تھی، اس کے ساتھ ہی ہم نے نالی بجائی تھی۔ دونوں تالیوں میں ایک سیکنڈ کے بھی دسویں حصے کا فاصلہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انداز سے کی غلطی ہو گئی۔" ٹیرا نے جواب دیا۔

"سوال تو یہ ہے کہ جس شخص نے بھی یہ حرکت کی، اسے تم دونوں سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔"

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔" طاؤس نے کہا۔

"کم از کم ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے سوچ میں کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"جی فرمایئے!" ٹیرا بولا۔

"وہ یہ کہ جس شخص نے بھی یہ حرکت کی ہے، وہ بھی سرکس میں کام کرتا رہا ہے۔"

"کیا!!" رنگ ماسٹر، ٹیرا اور طاؤس بری طرح چونکے۔ ٹامی بھی

حیرت زدہ نظر آیا۔

"ہاں! اسے اس کھیل کا کچھ تجربہ تھا، تبھی اس نے ایسا کیا تھا"۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے... ایس پی احسان علی شوکت کے چہرے پر بھی ایک رنگ آتا تھا تو دوسرا جاتا تھا۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہی کہتا ہے"۔ رنگ ماسٹر حکیم کے منہ سے نکلا۔

"اب سوال یہ ہے کہ کسی کو ان دو معصوموں سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے"۔ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"ہم خود حیران ہیں"۔

"نہیں ـــــ آپ لوگ حیران نہیں ہیں"۔ انسپکٹر جمشید نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"جی۔ کیا مطلب"۔ بہرام نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ آپ لوگ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ وہ کون ہے، البتہ یہ نہیں جانتے کہ کہاں رہتا ہے..."

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں"۔

"اس طرح کہ آپ کے یہ دونوں آدمی یعنی بٹرا اور طاؤس یا جو کچھ بھی ان کے نام ہیں، اس شخص کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں، انہوں نے اسے نہ جانے کس کس شہر میں تلاش کیا، لیکن اس شہر میں شاید پہلا موقع ہے کہ ان کے ساتھ کھیل کے دوران یہ چال

چلی گئی، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں اس کی تلاش میں ہیں، لہٰذا اس نے خوفزدہ ہو کر ان دونوں کو ہلاک کرنے کی ایک ایسی ترکیب سوچی جس سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا اور یہ دونوں موت کے گھاٹ اتر سکتے تھے، لیکن ان کی قسمت اچھی تھی کہ یہ بچ گئے۔ اب آپ لوگ اگر صاف صاف سب کچھ بتا دیں تو شاید ہم آپ لوگوں کی مدد کر سکیں، کسی کام آ سکیں۔"

خیمے میں چند لمحوں کے لیے گہری خاموشی طاری ہو گئی، یوں لگتا تھا جیسے سب پہ سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ آخر ٹامی نے کہا:

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کون ہیں، آپ ایس پی صاحب کے ساتھ ضرور آئے ہیں، لیکن آپ کی سرکاری حیثیت کیا ہے۔"

"میں اپنی سرکاری حیثیت بھی آپ کو بتا دوں گا، پہلے یہ بتائیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ کس حد تک درست ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے، ہم اپنے ایک دشمن کی تلاش میں ہیں، لیکن نہیں جانتے، وہ کہاں ہے۔ اس وار کے بعد ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ وہ اس قصبے میں موجود ہے۔" ٹامی نے کہا۔

"آپ کی اس سے دشمنی کیا ہے۔"

"بہت عرصہ پہلے وہ سرکس کی ایک بہت بڑی رقم پر ہاتھ صاف کر کے غائب ہو گیا تھا۔" ٹامی نے بتایا۔

"تو کیا وہ بھی سرکس میں ملازم تھا۔"

"جی ہاں ۔۔۔" حکیم کے منہ سے نکلا۔ اس دوران انسپکٹر جمشید انہیں بغور دیکھتے رہے تھے۔

"اس کا نام... عمر اور حلیہ بتائیے، تاکہ ہم بھی اسے تلاش کر سکیں۔"

"اس کا نام شیر شاہ ہے۔"

"کیا!!" اس مرتبہ محمود، فاروق، فرزانہ، انسپکٹر جمشید اور ایس پی احسان علی شوکت چلائے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔



"آپ نے کیا نام بتایا... شیر شاہ!" ایس پی کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! اس کا نام شیر شاہ ہے، اس وقت اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی، رنگ گہرا سانولا، آنکھیں چھوٹی اور ناک بہت لمبی ہے۔" حکیم بتاتا چلا گیا۔

"بہت خوب! آپ تو شیر شاہ ڈاکو کا حلیہ بتا رہے ہیں۔ وہ اس قصبے میں نہ صرف موجود ہے، بلکہ لوگوں کو لوٹتا بھی رہتا ہے۔ شاید آپ کی رقم اڑانے کے بعد اس نے یہی پیشہ اختیار کر لیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ ۔۔۔ کیا واقعی وہ اس قصبے میں موجود ہے۔" ٹامی کے لہجے میں جوش تھا۔

"ہاں! لیکن ابھی تک اسے گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ وہ ہر بار پولیس کے ہاتھوں سے بچ جاتا ہے"۔

"آپ فکر نہ کریں، پولیس کے ہاتھ سے وہ بے شک بچ سکتا ہے، لیکن ہمارے ہاتھوں نہیں" ہم اسے ہرگز نہیں چھوڑیں گے"، بہرام نے غصّے کے عالم میں کہا۔

"یہ سب تو خیر ٹھیک ہے، لیکن یہ تو بتائیے، آپ پولیس کو کیوں بے وقوف بنا رہے ہیں"۔ اچانک انسپکٹر جمشید نے کہا اور وہ سب حیران رہ گئے۔

"جی ــــ کیا مطلب؟" حکیم نے بھڑک کر کہا۔

"میں بہت دیر سے محسوس کر رہا ہوں کہ آپ لوگ ہمیں چکّر دے رہے ہیں"۔ انسپکٹر جمشید عجیب سے انداز میں مسکرائے۔

"کیا!!" ایس پی بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں! آپ کے گھر کے سامنے جب تھوڑی دیر پہلے ڈنگو اور بنگو سے ہماری جھڑپ ہوئی تھی تو ان کی آوازیں اور تھیں اور اب ان کی آوازیں اور ہیں"۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ کا مطلب ہے، ڈنگو اور بنگو کا تعلق اس سرکس سے ہے"، ایس پی کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"ہاں! وہ دونوں ہی کل خنجروں والا کھیل دکھا رہے تھے، انہی کے پہلو زخمی ہوئے تھے۔ جب کہ ہمارے سامنے جو ٹیرا

اور طاؤس موجود ہیں، ان کے بارے میں میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے پہلو زخمی نہیں ہیں، اگر مسٹر حکیم اور ٹامی کی باتیں درست ہیں اور انہوں نے صحیح آدمیوں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے تو پھر انہیں ضرور زخمی ہونا چاہیے تھا، کیونکہ سرکس شو میں کل میں بھی موجود تھا اور میں نے خود خنجر سے اُن دونوں کو زخمی ہوتے دیکھا تھا۔"

وہ سب سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ حکیم، ٹامی، ٹیرا اور طاؤس کی نظریں جھک گئیں، ایس پی نصیر آباد اور محمود، فاروق اور فرزانہ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

ایک اور جھٹکا

"مہربانی فرما کر ساری بات سچ سچ بتا دیجئے، ورنہ ہم آپ لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے، آپ ضرور کوئی بات چھپا رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے خاموشی کی مہر کو توڑتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ٹامی، اب ہمیں صاف صاف بتا ہی دینا چاہیے۔" حکیم نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"ٹھیک ہے حکیم ـــ تم ہی بتا دو۔"

"بہت اچھا ـــ تو جناب! بات یہ ہے کہ وہ دونوں دراصل ڈنگو اور بنگو ہی ہیں اور یہ ان کے قد و قامت کے دو اور کارکن ہیں۔ ڈنگو اور بنگو کل واقعی زخمی ہو گئے تھے، لیکن زخم بہت معمولی سے تھے، آج وہ صبح سویرے نہ جانے کس طرف نکل گئے، ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے، ہم نے ان دونوں کو آپ کے سامنے لا کھڑا کیا۔"

"ہوں۔ تو یہ بات تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ کل واقعات کی تفصیل کچھ اس طرح بنتی ہے، کل سرکس شو میں جس نامعلوم شخص

نے تالی بجائی وہ شبیر شاہ تھا، شبیر شاہ کسی زمانے میں سرکس میں ملازم تھا، وہ ایک دن سرکس کی بہت بڑی رقم چرا کر بھاگ گیا۔ آپ لوگ اسے شہر شہر تلاش کرتے رہے، اس طرح کئی سال گزر گئے اور آخر آپ لوگ یہاں پہنچ گئے، ڈنگو اور بنگو شبیر شاہ کو تلاش کرتے رہے، وہ ہر ہوٹل میں جا کر نئے آنے والوں کو بھی چیک کرتے کہ کہیں ہوٹل میں ہی شبیر شاہ نہ ٹھہرا ہوا ہو۔ ڈنگو بنگو ایاز ہوٹل بھی پہنچے اور ہوٹل کے مالک سے جھڑپ کے بعد پولیس کے آنے پر فرار ہو گئے لیکن جاتے ہوئے وہ ایس پی صاحب سے نمٹنے کی بھی دھمکی دے گئے۔ اسی شام وہ سرکس میں خنجر والا کھیل دکھا رہے تھے کہ کسی نے ان سے ایک لمحے پہلے تالی بجا دی اور ذرا پہلے مسٹر حکیم کے ہاتھ سے خنجر نکل گیا۔ خنجر سے وہ معمولی سے زخمی ہو گئے۔ دوسرے دن یعنی آج وہ ایس پی صاحب کے گھر تک پہنچ گئے، لیکن راستے میں ان سے ٹکرا گئے ہم، دونوں بے ہوش ہو گئے اور ہم انہیں سڑک پر ہی چھوڑ کر ایس پی صاحب کے گھر میں داخل ہو گئے، اس سے پہلے کہ پولیس ان پر قابو پاتی، وہ نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے... اور ابھی تک سرکس میں واپس نہیں آئے، کیوں۔ واقعات کی یہ ترتیب بالکل ٹھیک ہے نا۔"

"جی ہاں ــــ بالکل ٹھیک ہے۔" حکیم نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا۔ اب ہم چلتے ہیں۔ ہم شبیر شاہ کو گرفتار کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے اور اس دوران اگر ڈنگو اور بنگو واپس آجائیں تو آپ فوراً ہمیں اطلاع دیں گے، ہم ان دونوں سے بھی چند سوال کرنا چاہتے ہیں۔"

"ضرور ضرور — جونہی وہ آئے ہیں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔" طامی نے ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ!" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ دوسرے بھی باہر نکل آئے۔ جیپ میں بیٹھ کر وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو انسپکٹر جمشید بولے:

"ہمیں ایاز ہوٹل اتار دیجیے گا۔"

"بہت اچھا۔ لیکن اب اس معاملے کا کیا ہوگا، ڈنگو اور بنگو غائب ہیں۔ وہ مجھ پر پھر حملہ کر سکتے ہیں۔"

"آپ پولیس کے آدمیوں کو دروازے پر مقرر کر دیں۔" انہوں نے کہا۔

"پولیس والوں کی تو ان سے جان نکلتی ہے۔"

"تو پھر آپ اپنے گھر کے دروازے بند رکھیں اور پستول ہر وقت اپنے پاس رکھیں۔"

"لیکن پستول ان کا کیا بگاڑ لے گا۔" ایس پی نے حیران ہو کر کہا۔

"کیوں۔ کیا پستول کی گولی ان پر اثر نہیں کرتی۔"

"نہیں۔ میں نے تو یہی سنا ہے۔" اس نے پریشان آواز میں کہا۔

"صرف سنا ہی ہے نا، آپ فائر نوکر کے دیکھیے گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔ میں جانتا ہوں۔ میں تو حیران ہوں، آپ نے اسے بے ہوش کس طرح کر دیا تھا۔" اس نے کہا۔

"میں نے نہیں... میری بچی نے۔"

"یہ اور بھی حیرت کی بات ہے، آپ لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایاز ہوٹل سے میرے ہاں آ جائیں۔ ہوٹل کی مصیبت سے بھی بچ جائیں گے۔"

"آپ کو زحمت ہو گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لیے میری مدد کریں، میں اس وقت سخت پریشان ہوں۔"

"اچھا، آپ کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے ہم آج شام کو آپ کے ہاں آ جائیں گے۔" آخر انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ! آپ کا بہت بہت شکریہ!"

ایس پی احسان علی شوکت انہیں ایاز ہوٹل کے سامنے اتار کر آگے بڑھ گیا۔ اس وقت انسپکٹر جمشید ان سے بولے:

"کہو ـــــ کیا سمجھے؟"

"جی کیا مطلب؟" تینوں چونکے۔

"تم نے اب تک حالات کا کیا اندازہ لگایا۔"

"وہی جو آپ نے تفصیل سناتے ہوئے بیان کیا۔"

"اور اگر میں تم سے یہ کہہ دوں کہ ڈنکو اور بنکو اس وقت سرکس کے ہی کسی خیمے میں موجود تھے۔ جب ہم ٹامی وغیرہ سے باتیں کر رہے تھے۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔



"لیکن ابا جان! آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ایس پی کے گھر کے سامنے جب انہیں ہوش آیا ہوگا تو انہوں نے فرار ہونے کی سوچی، لیکن ان کے لیے سرکس سے اچھی جگہ چھپنے کی کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے وہ سیدھے ادھر آ گئے۔ ٹامی اور رنگ ماسٹر کو ساری بات بتائی۔ پھر پروگرام بنایا کہ اگر پولیس یہاں آئی تو کیا بیان دیا جائے گا اور یہ کہ ڈنکو اور بنکو کی جگہ شیرا اور طاؤس کو پیش کیا جائے گا، ظاہر ہے کہ رنگوں کی تہہ چڑھا لینے کے بعد سب چھوٹے قد والے تقریباً ایک جیسے نظر آتے ہیں۔"

"تو آخر یہ چکر کیا ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"چکر تو ابھی اچھی طرح میری سمجھ میں بھی نہیں آیا، ٹامی بہت دولت مند ہے، وہ کسی بڑی سے بڑی رقم کے لیے بھی اتنے سال تک

مارا مارا نہیں پھر سکتا۔ اصل بات ضرور کوئی اور ہے، دوسرے یہ بات مجھے بہت کھٹک رہی ہے کہ جس شخص کی وہ تلاش میں ہیں، اس کا نام شبیر شاہ ہے، شبیر شاہ کا نام پہلے ہی قصبہ نصیر آباد میں بہت مشہور ہے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ انہوں نے شبیر شاہ کا نام بھی بس یونہی بنا دیا ہے، دراصل جس کی انہیں تلاش ہے، وہ کوئی اور ہے، اس کا نام بھی کچھ اور ہے۔"

"معاملہ تو بہت الجھ گیا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں۔ اس لیے کہ سلجھے ہوئے معاملے سے ہمارا واسطہ کبھی پڑتا ہی نہیں۔" محمود نے کہا۔

"آخر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔" فرزانہ نے کہا۔

"زبردستی محاورے بولنے کی کوشش نہ کیا کرو۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

"اگر میں بول ہی دوں تو تم کان بند کر لیا کرو۔" فرزانہ جھلا کر بولی۔

باتوں کے دوران وہ سیڑھیاں بھی چڑھتے جا رہے تھے، آخر اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے، انہوں نے دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے اس پر ہاتھ مارا تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔

"ارے ... دروازہ تو اندر سے بند نہیں ہے۔" فرزانہ چونکی اور پھر جلدی سے اندر داخل ہو گئی، وہ بھی پریشان ہو کر اندر کی طرف بڑھے۔ بیگم جمشید اندر نہیں تھیں۔

"امی جان ۔۔۔ آپ کہاں ہیں" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید دوڑتے ہوئے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے، انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، غسل خانے اور الماریوں میں جھانکا اور تھوڑی دیر بعد انہیں یہ حقیقت معلوم ہو چکی تھی کہ بیگم جمشید کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔

پریشانی اور خوف نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ سب سے پہلے وہ ہوٹل کے کاؤنٹر پر گئے۔ کاؤنٹر والے سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے بتایا کہ صبح سے اب تک اس نے کسی عورت کو باہر جاتے نہیں دیکھا، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ پچھلے دروازے کو استعمال کیا گیا ہو۔ اب وہ دوڑتے ہوئے پچھلے دروازے پر آئے۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اس میں سے نکلتے چلے گئے۔ دروازہ ایک تنگ سی گلی میں کھلتا تھا۔

اچانک وہ چلتے چلتے رُک گئے۔ بیگم جمشید کے دائیں پیر کی چپل گلی میں دیوار کے ساتھ پڑی تھی اور اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ انہیں اسی راستے سے لے جایا گیا ہے۔ فاروق چپل کی طرف جھپٹا:

"چپل نہ اٹھانا۔ آؤ ہوٹل کے مالک کے پاس چلتے ہیں۔"

ہوٹل کے مالک نے انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھا، پھر ساری بات سن کر بولا:

"سب سے پہلے تو آپ پولیس کو فون کریں۔"

"وہ تو میں سب کر لوں گا، لیکن دن دہاڑے آپ کے ہوٹل میں اغوا کا کیس کیا گیا ہے، اس کی کچھ ذمے داری آپ پر بھی عائد ہوتی ہے۔" انہوں نے کہا اور ایس پی نصیر آباد کو فون کرنے لگے دوسری طرف سے فوراً جواب ملا۔

"ایس پی نصیر آباد۔"

"میں پروفیسر بول رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید یہاں تک ہی کہہ پائے تھے کہ احسان علی شوکت نے چہک کر کہا۔

"اوہ تو آپ ہیں۔ پھر آپ کس وقت پہنچ رہے ہیں۔"

"میری بیگم کو ہوٹل سے اغوا کر لیا گیا ہے۔" انہوں نے جلدی سے کہا۔

"اوہ آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔"

"اس وقت تو میں ہوٹل میں ہی موجود ہوں، لیکن فوراً ہی مجرموں کے پیچھے روانہ ہو رہا ہوں، آپ بھی کوشش شروع کر دیں۔"

"فکر نہ کریں، میں اسی وقت اپنے ماتحتوں کو دوڑا رہا ہوں اور خود بھی نکلتا ہوں۔" اس نے کہا اور انسپکٹر جمشید نے ریسیور رکھ دیا پھر ان تینوں کو ساتھ لے کر دوبارہ عقبی دروازے پر آئے، اس سے ہوتے تنگ سی گلی میں پہنچے، انہوں نے چیل کو جوں کا توں رہنے دیا۔ گلی ایک سڑک پر نکلتی تھی جو سیدھی چلی گئی تھی۔ انہوں نے

اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن کوئی ٹیکسی نظر نہ آئی، آخر وہ پیدل ہی چل پڑے۔

"ابّا جان ـــــ ہم پیدل کب تک چلیں گے، وہ انہیں ضرور ٹیکسی میں لے گئے ہوں گے۔" فرزانہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ہو سکتا ہے، مجرم خود ہی کوئی ٹیکسی بھیج دے، جو ہمیں اس کے ٹھکانے پر لے جائے۔" انسپکٹر جمشید کی آواز اب بھی پرسکون تھی۔

"کیا مطلب... کیا اس کا بھی امکان ہے۔" محمود نے چونک کر کہا۔

"ہاں ـــــ ایسا ہو سکتا ہے۔"

وہ سڑک پر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوٹل کی مخالف سمت میں بڑھنے لگے۔ اس سڑک میں دائیں بائیں کوئی اور سڑک بھی نہیں نکلتی تھی کہ اِدھر اُدھر سے ہی کوئی ٹیکسی آ جاتی۔

"کہیں یہ ہمیں اصل معاملے سے ہٹانے کی سازش تو نہیں ہے۔" محمود نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"تو کیا یہ سب سرکس والوں کی حرکت ہے۔" فاروق نے کہا۔

"اگر سرکس والوں کی حرکت نہیں ہے تو پھر کس کی ہے، اس وقت تک ہمارے سامنے ان کے علاوہ اور کون آیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"آیا بے شک کوئی نہیں، لیکن اس نامعلوم آدمی کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے جس نے تالی بجائی تھی۔" فاروق بولا۔

"لیکن ایسے ہمارے بارے میں بھلا کیا معلوم ہو سکتا ہے۔" فرزانہ نے اعتراض کیا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ تو پھر کیا سرکس والے کسی مجرمانہ پروگرام پر عمل کر رہے ہیں اور اسی لیے انہوں نے ہمیں اُلجھانے کے لیے امی جان کو غائب کر دیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"ان حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ابا جان! آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔" فاروق نے انہیں خاموش پا کر پوچھا۔

"میں ابھی سوچ رہا ہوں۔ بہت جلد اصل معاملہ سامنے آ جائے گا۔" انہوں نے کہا۔

"اس وقت تو ہمیں صرف امی جان کی فکر ہے۔" فرزانہ بولی۔

"فکر کرنے کی ضرورت نہیں، مجرم انہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔" محمود نے چونک کر پوچھا۔

"اغوا کرنے والا چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو، تم لوگوں کا یہ خیال بالکل ٹھیک ہے کہ یہ سب ہمیں اُلجھانے کے لیے کیا گیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

ان کی باتیں جاری رہیں، وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے رہے، یہاں تک کہ پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابھی تک انہیں کوئی ٹیکسی نظر نہیں آئی تھی۔

"یہ تو پہاڑیاں شروع ہو گئیں۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"چلو خیر، کچھ تو شروع ہوا۔" انسپکٹر جمشید دھیرے سے مسکرائے۔

اور پھر ایک جگہ اچانک ان کے قدم رُک گئے، انھوں نے ایک حیران کُن اور خوفناک ترین منظر دیکھا۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

بیگم جمشید سینکڑوں فٹ گہری کھائی کے اُوپر الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے پیروں میں ایک موٹا رسّا بندھا ہوا تھا اور اس رسّے کا سرا ایک اُونچی سی چٹان تک جا رہا تھا۔

وہ دہشت زدہ انداز میں رُک گئے۔

وعدہ

ابھی حیرت اور خوف سے ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی ہی تھیں کہ پہاڑیوں میں گونجتی ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"پروفیسر کرمانی! تمہاری بیوی کی موت میرے ایک اشارے کی بات ہے۔ یہ رسہ جس سے یہ بندھی ہے، اگر میں کاٹ دوں تو یہ سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گرے گی اور تمہیں اس کی ہڈیاں بھی تلاش کرنے میں دقت ہوگی، لیکن میں اس رسّے کو واپس بھی کھینچ سکتا ہوں اور تمہاری بیوی کو تمہارے پاس واپس بھیج سکتا ہوں، اور اس کی صرف ایک شرط ہے۔ تم شرط جاننے کے لیے بے چین ہو گئے ہو، تو سنو! تمہیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی وقت واپس اپنے شہر جانا ہو گا، اگر تم واپس جانے سے انکار کرو گے تو میں رسہ کاٹ دوں گا، تم لوگ اسے گرتے اپنی آنکھوں سے دیکھو گے اور اس کے بعد بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے کیونکہ میرے نشانے کی زد میں ہو، پہلے فائر سے میں رسہ کاٹوں گا اور اس کے بعد چار فائر تمہاری طرف کر دوں گا۔ قصہ ختم ہو جائے گا۔"

"سوال یہ ہے کہ تم ہو کون اور یہ کیوں چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔" انسپکٹر جمشید چلا کر بولے۔

"میں یہ نہیں بتا سکتا اور نہ تم مجھے دیکھ ہی سکتے ہو۔" آواز آئی۔

"بہت اچھا ___ مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" انسپکٹر جمشید نے محمود، فاروق اور فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کے چہروں پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ بہت بے قرار تھے، بس یہ چاہتے تھے کہ فوری طور پر ان کی امی جان رہا ہو جائیں، یہی دیکھ کر انہوں نے شرط ماننے کا اعلان کیا تھا۔

"بہت خوب! تو پھر میں تمہاری بیگم کو واپس بھیج رہا ہوں اور ہاں، یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تمہیں پہچانا نہیں، پروفیسر کرمانی کے بھیس میں اس وقت میرے سامنے انسپکٹر جمشید کھڑا ہے جس نے اپنا اور تینوں بچوں کا میک اپ تو کر لیا، لیکن اپنی بیگم کا میک اپ کرنا بھول گیا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی بیگم جمشید آہستہ آہستہ نیچے آنے لگیں۔ ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ پھر ان کے پیر ایک ابھری ہوئی چٹان پر لگ گئے اور وہ اس پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگیں۔

"اب تم لوگ آ کر اسے رسّے سے آزاد کرا سکتے ہو، لیکن یاد رکھو، اگر تم نے وعدہ خلافی کی اور اس شہر سے نہ گئے تو پھر یہاں

سے زندہ واپس نہیں جاؤ گے۔ ویسے تو میں جانتا ہوں، تم جو وعدہ کر لیتے ہو، اس سے کبھی نہیں پھرتے۔"

وہ تیزی سے بیگم جمشید کی طرف بڑھنے لگے۔ رسہ ابھی تک ان کے پیروں سے بندھا ہوا تھا اور اس کا دوسرا سرا چٹان کے اوپر سے ہوتا ہوا کہیں دوسری طرف تھا۔ پندرہ منٹ تک اچھل اچھل کر اونچی نیچی جگہوں پر چلتے ہوئے آخر وہ بیگم جمشید تک پہنچ گئے، انہوں نے ان کے پاؤں رستے سے آزاد کرائے، رسہ اسی طرح لٹکتا رہا، کسی نے بھی اسے نہ کھینچا۔

"ابا جان! کیا آپ دوسری جا کر دیکھیں گے"۔ محمود نے پوچھا۔

"نہیں! میں نے وعدہ کر لیا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس چلا جاؤں گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"۔ فرزانہ کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"تو کیا تم چاہتی ہو، میں وعدہ خلاف کہلاؤں۔" انسپکٹر جمشید نے آنکھیں نکالیں اور بیگم جمشید کو سہارا دینے لگے۔

"کیا خیال ہے بیگم، چل سکو گی یا کچھ دیر یہیں ٹھہرے رہیں"۔

"میں چل سکتی ہوں۔" انہوں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

انسپکٹر جمشید نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ واپس روانہ ہوئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کے چہرے بجھے بجھے تھے، وہ بہت مایوس

نظر آرہے تھے۔ ایسی شکست سے وہ کبھی دو چار نہیں ہوئے تھے۔ مجرم نے انہیں کس چالاکی سے مجبور کیا تھا۔

"سوال تو یہ ہے ابّا جان کہ وہ ہم سے اتنی نرمی کیوں برت رہا ہے، وہ ہم سب پر فائرنگ بھی تو کر سکتا تھا۔" فاروق نے کہا۔

"شاید قاتل بننا اسے پسند نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آج تک اس کی زندگی میں کسی کو قتل کرنے کی نوبت نہ آئی ہو اور وہ چاہتا ہو کہ ایسی نوبت آئندہ بھی نہ آئے، لہٰذا اس نے وہی کام کیا ہے کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"گویا ہم اس کے لیے سانپ ہو گئے۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"لیکن تم لوگ کیوں اداس ہو۔ ہنسو، بولو، چہکو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ابّا جان! ایسے میں ہم کس طرح ہنس سکتے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"کیوں ___ کیا ہو گیا ہے۔"

"ایک مجرم نے ہمیں واپس جانے پر مجبور کر دیا ہے، جب کہ شاید آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم کسی کیس کو درمیان میں چھوڑ کر واپس ہو گئے ہوں۔" محمود نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"آپ فکر مند نہیں ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے حیرت کا باعث ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ہیں کسی حال میں بھی فکر مند نہیں ہوا کرتا۔ خدا جو کرتا ہے، بہتر ہی کرتا ہے"۔ انہوں نے کہا۔

"آخر یہ چکر کیا ہے، امی جان کو اغوا کس نے کیا تھا اور وہ کون ہے"۔

"شیر شاہ نے، ان پہاڑیوں میں اس کا ٹھکانا ہے"۔

"لیکن شیر شاہ یہ کیوں چاہتا ہے کہ ہم یہاں سے چلیں جائیں" فاروق نے پوچھا۔

"اگر ہمیں یہ بات معلوم ہو جائے تو پورا کیس حل ہو جائے گا"۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن اب پورا کیا آدھا کیس بھی حل نہیں ہو گا، ہم تو واپس جا رہے ہیں"۔ فاروق نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے"۔ فرزانہ بولی۔

"آپ کو میری وجہ سے دشمن کی شرط نہیں ماننی چاہیے تھی"۔ بیگم جمشید نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ وہ انسپکٹر جمشید کا سہارا لے کر چل رہی تھیں۔

"فکر نہ کرو بیگم، میں نے جو کچھ کیا ہے، ٹھیک ہی کیا ہے۔ اس وقت اس کے علاوہ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا، اس کی شرط نہ مانتا تو تمہارے ساتھ ہماری جانیں بھی جاتیں اور اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا"۔ انہوں نے کہا۔

"اب ہم کہاں جائیں گے"۔ محمود نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے، پہلے ایاز ہوٹل جائیں گے، وہاں سے اپنا سامان اُٹھائیں گے اور اسٹیشن کی راہ لیں گے، تم اتنا بھی نہیں سمجھتے"۔ فاروق نے جھلا کر کہا۔

"ہاں! فاروق ٹھیک کہتا ہے"۔

"سچ بات تو یہ ہے کہ آج سے زیادہ مایوسی ہمیں کبھی نہیں ہوئی ہو گی"۔

"بھئی اب اتنے مایوس بھی نہ ہو، یہ ضروری بھی تو نہیں کہ ہر مرتبہ ہم ہی کامیاب ہوں"۔ انسپکٹر جمشید نے ہنس کر کہا۔

اسی طرح سڑک پر پیدل ہی چلتے ہوئے وہ ہوٹل تک پہنچ گئے اور جب وہ اپنا سامان اُٹھا کر اور ہوٹل کا بل ادا کر کے باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا، عین اسی وقت ایس پی نصیر آباد کی جیپ وہاں آ کر رکی تھی۔ اس نے جیپ سے اُتر کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا:

"ارے... آپ کی بیگم مل گئیں، میں تو انہیں نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈ کر آ رہا ہوں اور بہت سے آدمی دوڑے پھر رہے ہیں"۔

"جی ہاں ـــــ یہ پہاڑیوں میں مل گئی تھیں"۔

"اوہ ـــــ چلیے شکر ہے، اس کا مطلب ہے، اب آپ میرے گھر چل رہے ہیں"۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔

"مجھے افسوس ہے، ہم آپ کے ہاں نہیں چل رہے، ایک بہت ضروری کام سے واپس جانا پڑ گیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کیا مطلب، یعنی آپ سارا معاملہ درمیان میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔" ایس پی نصیر آباد نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں —— مجبوری ہے۔"

"یہ یکایک ایسی کیا مجبوری آ پڑی۔" اس نے انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو فون پر سب کچھ بتا دوں گا، اس وقت تو ہم جلدی میں ہیں۔"

"مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا ہے، میں حیران ہوں، یکایک آپ نے واپسی کا پروگرام کیوں بنا لیا، خیر میں کیا کہہ سکتا ہوں، آیئے میں آپ کو جیپ میں اسٹیشن پہنچا دوں۔"

"جی نہیں شکریہ! ہم ٹیکسی میں چلے جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے۔ جیپ جو موجود ہے۔"

"کیا آپ اس وقت اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی نہیں! جا تو میں پولیس چوکی کی طرف رہا ہوں، ان سب لوگوں کو واپس بلانا ہے جنہیں آپ کی بیگم صاحبہ کی تلاش میں

دوڑایا تھا۔"

"تب پھر ہم آپ کے ساتھ نہیں جا سکتے۔" انہوں نے کہا۔

"کیوں؟" احسان علی شوکت کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"اس لیے کہ جیپ آپ کو صرف سرکاری کاموں کے لیے ملی ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایس پی سے ہاتھ ملائے اور آگے بڑھ گئے۔ ایس پی نصیر آباد انہیں ہکا بکا دیکھ رہا تھا، اسی وقت ایک ٹیکسی ان کی طرف لپکی اور وہ اس میں بیٹھ گئے۔



جونہی وہ لوگ پہاڑیوں سے سڑک پر پہنچے، رسہ اُوپر کھینچ لیا گیا۔ چٹان کے اوپر اس وقت تین آدمی تھے اور ان تینوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

"انسپکٹر جمشید کو بھی آج جیسی شکست کبھی نصیب نہیں ہوئی ہو گی۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ اس کا قد بڑا سا تھا اور آنکھوں میں تیز چمک، چہرے پر شیطانی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

"آپ کا نام بھی آخر شیر شاہ ہے، اس پورے قصبے پر آپ کا راج ہے۔" اس کے ساتھ کھڑے دوسرے آدمی نے کہا۔

"لیکن دل روز خان، اس راج دھانی میں آج کل دو ننھے شیطانوں

نے ادودھم مچا رکھا ہے، کیا تم ان کا کچھ نہیں کر سکتے؟" شبیر شاہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"آپ سرکس کے ہال میں ایک کوشش کر چکے ہیں، اب ہماری باری ہے۔ ہم نے ایک بہت بہترین پروگرام بنایا ہے۔"

"ذرا میں بھی تو سنوں کہ وہ پروگرام کیا ہے، کیونکہ میرے خیال کے مطابق پروگرام تو میرا بھی بہت بہترین تھا، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔" شبیر شاہ نے کہا۔

"خیر آپ دیکھ ہی لیں گے کہ ہم ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔"

"لیکن میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔" شبیر شاہ نے کہا۔

"تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔" دل روز خان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس میں چاہتا ہوں، وہ لوگ بے کار ہو کر رہ جائیں، اگر وہ لنگڑے ہو جائیں یا دونوں ٹانگوں سے محروم ہو جائیں تو کسی کام کے نہیں رہ جائیں گے اور میرا مقصد حل ہو جائے گا۔"

"آخر آپ کی ان سے دشمنی کیا ہے۔" دل روز خان کے ساتھ کھڑے دوسرے آدمی نے کہا۔

"بہت پرانی دشمنی ہے شہ زور خان۔ پھر کبھی بتاؤں گا، اس وقت تو مجھے ایک جگہ جانا ہے، ہاں تم نے بتایا نہیں کہ ان دونوں کے لیے کیا سوچا ہے۔"

"ہم نے سوچا ہے کہ ادھر تو وہ شو دکھاتے میں مصروف ہوں گے، اُدھر ہم ان کے خیمے میں داخل ہو جائیں گے اور جب وہ دونوں واپس آئیں گے تو ہم انہیں دبوچ لیں گے، وہ ہیں بھی کتنے ڈبل ڈول والے۔" دل روز نے اکڑ کر کہا۔

"یہ نہ کہو، کیا تم نہیں جانتے، شہر کے سارے لوگ ان سے تھر تھر کانپتے ہیں، انہوں نے اپنا یہ رُعب اور دبدبہ صرف ایک ماہ میں بنایا ہے۔"

"شاید لوگ ان سے بلا وجہ ڈرنے لگے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ آج ان کا بندوبست ہو جائے گا۔" شہ زور بولا۔

"میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں، انہیں جان سے ہرگز نہ مارنا۔"

"بہت اچھا۔ وہ ساری عمر کے لیے اپاہج ہو جائیں گے، آئندہ بیساکھیوں کے سہارے چلا کریں گے۔" دل روز خان نے مسکرا کر کہا۔

"بہت خوب! اگر تم نے آج مجھے یہ خوش خبری سنا دی تو میں تمہیں اتنا کچھ دوں گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر شیر شاہ پہاڑیوں پر اُترنے لگا۔



سرکس میں ان دنوں خنجروں والا کھیل نہیں دکھایا جا رہا تھا، اس وجہ سے رش بہت کم ہو گیا تھا۔ اب بہت کم لوگ سرکس

دیکھنے آتے تھے۔ سرکس والوں نے قصبے میں اعلان کیا تھا کہ چونکہ ان کے دونوں کارکن زخمی ہو گئے ہیں، اس لیے ان کے صحت یاب ہونے تک وہ خنجروں والا کھیل پیش نہیں کر سکیں گے، البتہ ہلکے پھلکے کھیل ضرور پیش کرتے رہیں گے اور جونہی وہ صحت یاب ہوئے، خنجروں والا کھیل پیش کیا جانے لگے گا۔ اس وقت بھی ڈنگو اور بنگو ہال میں موجود تھے اور جھولوں پر کرتب دکھا رہے تھے، جھولا جھولتے ہوئے ایک جھولے سے دوسرے پر اور دوسرے سے تیسرے پر آجا رہے تھے، لیکن تماشائیوں میں وہ جوش و خروش نہیں تھا۔ شاید جتنے بھی لوگ سرکس دیکھنے آئے تھے، بچوں کے مجبور کرنے پر آئے تھے۔ ظاہر ہے بچوں کو یہ کیا معلوم کہ بڑوں کی دلچسپی کس چیز میں ہے۔

ڈنگو اور بنگو پندرہ منٹ تک جھولوں پر تیرتے رہے، آخر وہ نیچے اتر آئے اور تماشائیوں کو سلام کر کے رِنگ کے دروازے میں داخل ہوئے۔ وہاں سے نکل کر وہ اپنے خیمے کی طرف بڑھے۔

"آج شام ہم پہاڑیوں کے دامن میں چلیں گے، ہمیں اس شخص کو بھی چیک کرنا چاہیے جو سنیرشاہ بنا بیٹھا ہے، ذرا دیکھیں تو سہی، وہ کون ہے۔ کہیں وہی تو ہمارا دشمن نہیں ہے۔" ڈنگو کہہ رہا تھا۔

"ضرور چلیں گے، لیکن شیرشاہ سے زیادہ تو میرے ذہن میں وہ آدمی چبھ رہا ہے جس کے ساتھ تین بچے تھے۔ پہلے ان سے ہوٹل

میں ملے تھے اور دوسری ملاقات ایس پی کے گھر کے سامنے ہوئی تھی، اس لڑکی نے تو ہمیں بے ہوش ہی کر دیا تھا۔" بنگو بولا۔

"ہاں یار... مجھے بھی ان پر حیرت ہے۔ ہوٹل کے رجسٹر کے مطابق بچوں کے باپ کا نام پروفیسر کرمانی ہے۔ یہ نام بھی تو کچھ کم عجیب نہیں۔" ڈنگو نے کہا۔

"کم از کم میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔" بنگو بولا۔

"اور وہ کیا؟" ڈنگو نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ کہ ہمارا شکار پروفیسر کرمانی ہرگز نہیں ہے۔"

"ہاں! یہ تو میرا دل بھی کہتا ہے۔ ہمارے راستے میں مشکل تو یہی ہے کہ ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ہمارا شکار دراصل کون ہے، ایک بار معلوم ہو جائے، اس کے بعد تو ہم اس سے اچھی طرح نبٹ لیں گے۔"

"چلو خیر، ہمیں یہ تو معلوم ہوا کہ وہ نصیر آباد میں ہی رہتا ہے اور ہر پُر فضا شہر کے ہوٹلوں کی خاک چھاننے کی بھی ہمیں ضرورت نہیں رہی۔ ہمیں معلوم تھا، وہ موسم گرما میں پُر فضا شہروں میں ضرور جاتا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ رہنے کے لیے بھی مستقل طور پر ایک پُر فضا شہر کو ہی چُن لے گا۔ اب ہم اسے تلاش کر ہی لیں گے۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ اپنے خیمے میں داخل ہوئے، سورج

غروب ہوچکا تھا اور خیموں کے آس پاس ہلکی روشنی والے بلب جل رہے تھے جب کہ ان کے خیمے میں اندھیرا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی انہیں ایک عجیب سا احساس ہوا اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ اسی وقت دو ہولناک چیخیں فضا میں بلند ہوئیں اور وہ تھرا اٹھے۔ یہ چیخیں ان کے منہ سے نہیں نکلی تھیں۔ گھبراہٹ کے عالم میں ڈنگو نے سوئچ دبا دیا۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی انہوں نے ایک بھیانک منظر دیکھا۔ دو آدمی پڑے تڑپ رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے لیکن ایک کا خنجر دوسرے کے پیٹ میں اور دوسرے کا خنجر پہلے کے پیٹ میں پیوست ہو چکا تھا۔ آن کی آن میں وہ سمجھ گئے کہ دونوں حملہ آور انہیں قتل کرنے کی نیت سے آئے تھے، جونہی وہ اندر داخل ہوئے ان کی چھٹی حس نے انہیں خبردار کر دیا اور وہ گر پڑے۔ دونوں نے خنجر چلائے اور خود ہی ایک دوسرے کا شکار ہو گئے۔

دونوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ جلد ہی ان کے خیمے کے آس پاس لوگ جمع ہو گئے۔ پولیس کو فون کیا گیا۔ پندرہ منٹ بعد ایس پی نصیر آباد وہاں پولیس کے آدمیوں کے ساتھ پہنچ گیا... وہ یہ منظر دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ شک کی کوئی وجہ نہیں تھی، خنجر پر ابھی تک دونوں قاتلوں کے ہاتھ مضبوطی سے جمے

تھے۔ آخر لاشیں اُٹھوا لی گئیں۔

دوسرے دن کی تفتیش کے بعد نصیر آباد سے شائع ہونے والے اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ دونوں حملہ آور شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔

اسی روز یہ خبر اُڑی کہ سرکس میں کام کرنے والے دو چھوٹے قدوں والے غائب ہو گئے ہیں، لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ سرکس کے مالک ٹامی نے ان کی گمشدگی کی کوئی رپورٹ درج نہ کرائی، لوگوں کو گمشدگی کا پتا اس طرح چلا کہ شو کے دوران صرف دو چھوٹے قدوں والے کام کرنے کے لیے آئے جب کہ ہر روز چار آیا کرتے تھے۔ لوگوں کو یہ سب واقعات عجیب سے لگ رہے تھے۔ ڈنگو اور بنگو کا مختلف ہوٹلوں میں ہل چل مچانا، پولیس کے قابو میں نہ آنا، ادھر شبیر شاہ کی کارروائی، اس کے ڈاکوں میں بھی روز بروز تیزی آگئی تھی، پھر سرکس کے شو کے دوران اس نامعلوم آدمی کا تالی بجانا اور ڈنگو اور بنگو کا زخمی ہونا، اگرچہ لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سرکس میں کام کرنے والے دراصل ڈنگو اور بنگو ہیں۔ پھر بھی ان لوگوں کو یہ سب واقعات بہت عجیب لگ رہے تھے۔ چھوٹا سا قصبہ تھا اور واقعات اس طرح پیش آ رہے تھے جیسے بہت ہنگامہ پرور شہر ہو۔

لیکن ابھی تو نصیر آباد کے رہنے والوں کو ایک اور حادثے کی خبر سننا تھی جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

واپسی اور...

وہ دارالحکومت کے اسٹیشن پر اُترے تو محمود، فاروق اور فرزانہ بہت اداس تھے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے ساتھ سارا شہر اُداس ہو۔

"بھئی اب اس قدر اداسی بھی اچھی نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے ان کی حالت سے لُطف لیتے ہوئے کہا۔

"تو ابا جان! آپ جس قدر اداس ہمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں، بتا دیں۔" فاروق نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"میں تو چاہتا ہوں، تم ذرا بھی اداس نظر نہ آؤ۔" انہوں نے کہا اور قریب سے گزرتی ایک ٹیکسی روک لی۔

انہیں گھر کے دروازے پر اتارتے ہوئے انہوں نے کہا:

"میں ذرا دفتر ہو آؤں، تم لوگ آرام کرو، لیکن ابھی سامان نہ کھولنا۔"

"جی۔ سامان نہ کھولیں، کیا مطلب؟" محمود اور فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"سامان میرے آنے پر کھولا جائے گا۔" انہوں نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" بیگم جمشید بولیں۔

"ابھی تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آجائے گی۔"

اس کے ساتھ ہی ٹیکسی چل پڑی اور وہ دروازے میں کھڑے سوچتے ہی رہ گئے۔

"ابا جان شاید بہت کچھ جانتے ہیں، لیکن فی الحال ہمیں کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" فرزانہ بولی۔

"خیر، اندر تو چلو۔"

وہ اندر آکر بیٹھ گئے۔ سامان انہوں نے فرش پر ہی جوں کا توں رکھ دیا۔

"کیا اس سامان میں کوئی خاص چیز ہے۔" محمود بولا۔

"نہیں! ہمارے سامنے ہی تو سارا سامان رکھا گیا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، ابا جان نے نظر بچا کر کچھ رکھ دیا ہو۔" فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

"میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے۔" محمود نے اچانک کہا

"خدا کا شکر ہے کہ دو نہیں آتیں۔" فاروق مسکرایا۔

"سنو! نصیر آباد سے واپس آنے کا فیصلہ ابا جان نے کیا ہے

یہ وعدہ مجرم سے ہم نے نہیں کیا، تو کیوں نہ ہم تینوں واپس نصیر آباد چلیں۔"

"بات تو بہت زور دار ہے اور ہم اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں، لیکن ابّا جان اجازت دیں تب نا، جن لوگوں نے ہماری امّی جان کے ساتھ یہ سلوک کیا، کیا ہم ان سے انتقام لینا نہیں چاہتے، ہمارا تو خون کھول رہا ہے۔" محمود کا چہرہ یہ کہتے کہتے سرخ ہو گیا۔

" انشاء اللہ ہم ابّا جان سے اجازت لینے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ امّی جان بھی ہماری سفارش کریں گی۔" فرزانہ بولی۔

"میں تمہیں مشکل میں نہیں دیکھ سکتی۔" انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

" مشکلات سے کھیلنا تو ہماری عادت ہے۔" فاروق نے کہا۔

"خیر دیکھا جائے گا، تمہارے ابّا جان آلیں تو کچھ فیصلہ ہو جائے گا۔"

" اور میرا تو یہ خیال ہے کہ ابّا جان خود ہی ہمیں ساتھ لے کر نصیر آباد جائیں گے۔" فرزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔" محمود نے پوچھا۔

" آخر انہوں نے سامان نہ کھولنے کی ہدایت کیوں کی ہے، کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اسی وقت دوبارہ روانہ ہونے والے ہیں۔"

"لیکن اس وقت تو کوئی گاڑی نہیں جاتی۔"

"اور پھر ابا جان وہاں سے واپس آنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اب وہ کس طرح جا سکتے ہیں۔"

"سنو! مجرم نے ان سے یہ وعدہ لیا ہے کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نصیر آباد سے واپس لوٹ جائیں گے، چنانچہ وہ واقعی واپس آگئے ہیں، اب انہوں نے یہ وعدہ تو نہیں کیا کہ دوبارہ نصیر آباد نہیں جائیں گے۔" فرزانہ نے دلیل پیش کی۔

"اوہ! تمہاری بات میں تو بہت وزن ہے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"ہاں چاند گاڑی جتنا وزن تو ضرور ہوگا۔" فاروق چہکا۔ اب انہیں نصیر آباد جانا ممکن نظر آنے لگا تھا، اس لیے ان کی زبانیں چل پڑی تھیں۔

"کیا مجھے خلا میں بھیجنے کا ارادہ ہے۔" محمود بولا۔

"خلا میں ابھی تم جیسوں کی ضرورت نہیں۔" فاروق نے کہا۔

"چلو تم چلے جانا۔"

"کہاں جانے کا پروگرام بنا رہے ہو۔"

انسپکٹر جمشید کی آواز نے انہیں چونکا دیا اور اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ وہ گھر کا دروازہ اندر سے بند کرنا بھول گئے تھے۔

"ابا جان! ہم نصیر آباد جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے، ہم ابھی تھوڑی دیر بعد ہی بذریعہ جہاز واپس نصیر آباد جا رہے ہیں اور میک اپ کے بغیر جائیں گے، کیونکہ اب میک اپ کی بھی ضرورت نہیں۔"

"وہ مارا ——" تینوں خوشی سے چلا اٹھے۔

اتنی دیر میں بیگم جمشید چائے تیار کر چکی تھیں، انہوں نے چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ جلدی جلدی حلق سے اتارے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔

"ابا جان! ہم پہلے ہی اندازہ لگا چکے تھے کہ آپ صرف مجرم سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں اور فوراً ہی واپس روانہ ہوں گے۔" فرزانہ نے مسرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے یہاں دو ایک اور کام بھی تھے، ان کے لیے بھی آنا ضروری تھا۔" انہوں نے کہا۔

"کیا آپ ہمیں نہیں بتائیں گے، وہ کیا کام تھے۔"

"ابھی نہیں! کچھ دیر بعد بتاؤں گا۔" وہ بولے۔

"آپ کا مطلب ہے، جہاز میں بتائیں گے۔"

"نہیں! نصیر آباد پہنچ کر، بلکہ اس سے بھی بعد۔"

"جیسے آپ کی مرضی! اب ہمیں بے شک کچھ نہ بتائیں۔" فاروق کھلا پڑ رہا تھا۔

اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ واپس نصیر آباد میں موجود تھے۔

جب وہ اباز ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے تو فاروق نے کہا:

"لیکن ابا جان! ہمارے کمروں میں تو کوئی اور آ چکا ہو گا۔"

"وہ کیوں۔ مجھے تو معلوم تھا کہ ہم بہت جلد واپس آ جائیں گے، جاتے ہوئے میں نے ہوٹل کا بل تو چکایا ہی تھا، دونوں کمرے اپنے اصل نام سے دوبارہ بک کرا لیے تھے۔" انہوں نے بتایا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

وہ اپنے کمروں میں داخل ہوئے تو اتنے خوش تھے جیسے انہیں کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ شام کے کھانے کے بعد انسپکٹر جمشید نے ان سے کہا:

"تیاری کر لو۔ ہم نصیر آباد کی پہاڑیوں کی طرف جائیں گے، اس جگہ جہاں تمہاری امی جان ملی ہوئی تھیں۔" ان کا لہجہ کھلنڈرا تھا۔

وہ اس لہجے سے واقف تھے، بظاہر اس لہجے سے بچوں جیسی خوشی ٹپکتی تھی، لیکن وہ جانتے تھے، اس لہجے میں وہ صرف اس وقت بولتے تھے، جب انتہائی خوفناک موڈ میں ہوں۔



چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ چاند سر ابھار چکا تھا اور اس کی دھیمی دھیمی روشنی نصیر آباد کی پہاڑیوں پر کھیل رہی تھی۔ ان سے اپنا دل بہلا رہی تھی۔ ایسے میں چار سائے ان پہاڑیوں میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید تھے۔ بیگم جمشید

کو انھوں نے ہوٹل میں ہی چھوڑ دیا تھا اور ہدایت کر دی تھی کہ ان کی آواز سنے بغیر دروازہ نہ کھولیں۔

پہاڑیوں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ دور دور تک انہیں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے میں چیخ کی ایک آواز انہیں بہت عجیب لگی۔ وہ چونک اٹھے۔ پہلے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر آواز کی طرف بڑھنے لگے۔

"ہمیں چھپ کر سب کچھ دیکھنا ہے۔ سامنے آنے کی کوشش نہیں کرنی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے انہیں خبردار کیا۔

"وہ کیوں اباجان!" فرزانہ نے پوچھا۔

"اس لیے کہ دشمنوں کو یہی خیال رہے، ہم واپس جا چکے ہیں اور لوٹ کر نہیں آئے۔"

"آخر یہاں کون لوگ ہیں اور کیا کر رہے ہیں!" محمود نے الجھ کر کہا۔

"کیا تم لوگ ابھی تک نہیں سمجھ سکے؟"

"ہمیں تو اس کیس کا کوئی سر پیر نظر ہی نہیں آیا۔" فرزانہ بولی۔

"بہت جلد نہ صرف سر پیر بلکہ دھڑ بھی نظر آنے لگے گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا آپ کو اندازہ ہے، وہ چیخ کس کی تھی؟"

"ہاں! کسی قدر لیکن صحیح صورتِ حال موقعے پر جا کر معلوم ہو گی۔"

پھر کچھ فاصلے پر انہیں ایک ہموار میدان سا نظر آیا۔ یہ میدان پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا تھا اور صرف نزدیک پہنچنے پر ہی نظر آ سکتا تھا۔ اس میدان کے عین اوپر وہی چٹان تھی جس کے ساتھ بیگم جمشید انہیں لٹکی نظر آئی تھیں اور اس چٹان سے ذرا نیچے ایک اور اُبھری ہوئی چٹان تھی جس پر انہیں رسّہ لٹکا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔

"ارے! یہ تو وہی جگہ..." محمود نے کہنا چاہا، لیکن انسپکٹر جمشید نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خاموش! ذرا سی بے احتیاطی کام بگاڑ سکتی ہے۔" انہوں نے سرگوشی کی اور انہوں نے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ تاریک گوشوں کا سہارا لیتے ہوئے وہ آگے کھسکنے لگے، یہاں تک کہ عین اس میدان کے سرے پہ پہنچ گئے۔ اب ان کے سامنے ایک حیرت انگیز منظر تھا۔

چاند کی روشنی میں دو رسے اسی چٹان سے لٹک رہے تھے، لیکن ان سے کوئی انسان اُلٹا لٹکا ہوا نظر نہیں آیا، البتہ ڈنگو اور بنگو میدان کے بیچوں بیچ کھڑے تھے اور ان کے گرد آٹھ آدمی پستول لیے کھڑے تھے، انہوں نے اپنے چہرے سیاہ نقابوں میں چھپا رکھے تھے۔ ایک نواں آدمی منہ پر مکمل نقاب اوڑھے الگ کھڑا تھا، پھر اس نے گرج دار آواز میں کہا:

"اب تم دونوں میرے قبضے میں ہو، کہو کیا کہتے ہو۔"

"کیا تمہارا ہی نام شیر شاہ ہے۔"

"ہاں ــــ میرا نام ہی ہے۔"

"تو پھر ہمیں اپنی کمر ننگی کر کے دکھا دو۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ تم ہی وہ شخص ہو، جس کی ہمیں تلاش ہے"۔ ڈنگو نے کہا۔

"تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میرا نام شیر شاہ ہے"۔ نو وارد آدمی نے کہا۔

"اگر ہمارا کمال دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی کمر ننگی کر کے دکھا دو"۔ بنگو نے تلملا کر کہا۔

"بہت اچھا! میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کروں گا"۔ یہ کہہ کر وہ ان آٹھ آدمیوں کی طرف بڑھا جنہوں نے ڈنگو اور بنگو کو پستولوں کی زد پر لے رکھا تھا۔

"کیا خیال ہے، اگر ان لوگوں نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو تمہارا نشانہ خطا تو نہیں جائے گا"۔

"آپ بے فکر رہیں، ہمارا نشانہ آج تک خطا نہیں گیا"۔ آٹھ میں سے ایک نے کہا۔

"بہت خوب! اب میں ان کی تسلی کے لیے اپنی کمر انہیں دکھاؤں گا اور اس کے بعد ہم ان دونوں کو ان رسّوں سے اُلٹا لٹکائیں گے، کیونکہ انہوں نے مجھے بہت پریشان کیا ہے"۔

یہ کہہ کر سنیر شاہ نے اپنی کمر پر سے قمیص اُلٹا دی۔ کمر کا رُخ اس نے پہلے ہی ان دونوں کی طرف کر دیا۔ اتفاق سے اس وقت اس کی کمر محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کی نظروں کے سامنے بھی تھی۔

انہوں نے دیکھا، سنیر شاہ کی کمر پر تقریباً نو انچ لمبا تلوار کے زخم کا گہرا نشان تھا، نشان اتنا صاف تھا کہ چاند کی روشنی میں بھی انہیں بالکل صاف نظر آیا تھا۔

اس نشان پر نظر پڑتے ہی ڈنگو اور بنگو نے پوری قوت سے ایک چیخ ماری اور پھر وہ ہو گیا جس کے بارے میں شاید کسی کو خیال تک نہیں تھا۔

دوسری چیخ

ڈنگو اور بنگو نے چیخ مارتے ہی ہوا میں اتنی بلند چھلانگیں لگائی تھیں ہ پستولوں کی گولیاں ادھر ادھر سے نکل گئیں، خود شیر شاہ نے زمین ر گر کر اپنی جان بچائی تھی۔ ڈنگو اور بنگو زمین پر آتے ہی ان آٹھوں ر ٹوٹ پڑے، ان کے ہاتھ اور پیر بجلی کی طرح حرکت کر رہے تھے اور اس کے ساتھ وہ کچھ اس طرح اچھل کود رہے تھے کہ نظر ن پر ٹکانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ہوا میں پلٹنیاں کھا رہے تھے، چکر پھیریاں کاٹ رہے تھے اور پستول کی ہر گولی ان کے آس پاس سے نکل رہی تھی، پھر ایسا وقت بھی آیا کہ پستول والوں کو پستولوں میں گولیاں بھرنے کا بھی ہوش نہ رہا، وہ ہاتھوں اور پیروں سے لڑنے پر مجبور ہو گئے، لیکن بھلا وہ ڈنگو اور بنگو کے مقابلے میں کیا ہاتھ پیر چلاتے۔ صرف چند منٹ کے اندر اندر آٹھوں زمین پر آ رہے۔ ان میں سے کسی کی ناک سے خون بہہ رہا تھا تو کسی کے منہ سے، کسی کا سر زخمی تھا تو کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔

ان سے فارغ ہوتے ہی دونوں شیر شاہ کی طرف مڑے اور

پھر دھک سے رہ گئے۔

"ارے، شبیر شاہ کہاں گیا"۔

"ابھی تو یہیں تھا۔ شاید اسے اپنے آدمیوں کی شکست صاف نظر آ گئی تھی، اس لیے وہ بھاگ کھڑا ہوا" بنگو نے کہا۔

"یہ کیا ہوا، اب ہمیں اسے پھر تلاش کرنا پڑے گا" ڈنگو نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"وہ بچ کر نہیں جا سکتا، یہیں کہیں پہاڑیوں میں ہو گا۔ آؤ اسے تلاش کریں"۔

"میں اس تلاش میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں"۔

چٹانوں میں ایک آواز گونجی۔ یہ آواز انسپکٹر جمشید کی تھی۔ ڈنگو اور بنگو بھڑک اٹھے۔ اور پھر ان کی آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں، ان کے سامنے ایک نوجوان آدمی اور تین بچے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکی بھی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی۔ اس گڑیا کو ڈنگو اور بنگو بڑی اچھی طرح پہچانتے تھے۔ حیرت کے ساتھ ان کی آنکھوں میں خوف بھی تھا۔

"آپ... آپ وہی تو نہیں"۔ ڈنگو ہکلایا۔

"ہاں ہم وہی ہیں، اور یہ گڑیا بھی وہی ہے جس کے پیٹ سے نکلنے والے دھوئیں نے تم دونوں کو بے ہوش کر دیا تھا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم تمہیں شبیر شاہ کی تلاش میں مدد دے سکتے ہیں"۔

"وہ کیسے، آپ کو کیسے معلوم کہ وہ کہاں گیا ہے، آخر آپ کون ہیں اور بار بار ہمارے راستے میں کیوں آ جاتے ہیں؟" بنگو نے اُلجھ کر کہا۔

"ہم تمہارے راستے میں نہیں آتے بلکہ اپنے راستے پر چلے جا رہے ہیں، البتہ تم اس راستے پر ہمیں آ ملتے ہو اور اب میں اچھی طرح جان گیا ہوں کہ ہم ایک ہی راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں شیر شاہ تک لے جا سکتا ہوں، ورنہ مجھے تو اس سے جا کر ملاقات کرنی ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے، ہم آپ لوگوں کے ساتھ چلیں گے۔"

"لیکن تمہیں ایک وعدہ کرنا ہو گا اور وہ یہ کہ تم اسے جان سے نہیں مارو گے۔"

"ٹھیک ہے۔ کیا آپ کا تعلق اس کے دشمنوں سے ہے؟"

"ہاں! ہم اس کے دشمن ہیں۔"

"تب تو ہمارا ساتھ اور بھی بہتر رہے گا۔" ڈنگو نے خوش ہو کر کہا۔

اور وہ واپس شہر کی طرف چل پڑے۔ آخر شہر میں داخل ہونے کے بعد انسپکٹر جمشید ایک گھر کے سامنے رک گیا، انہوں نے ڈنگو اور بنگو کو تاریکی میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ پھر گھنٹی بجائی دروازہ فوراً ہی کھل گیا اور ایس پی نصیر آباد احسان علی شوکت کا چہرہ نظر آیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت کی چمک

لہرائی، ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلا:

"آپ... آپ انسپکٹر جمشید تو نہیں ہیں؟"

"ہاں! اور یہ میرے بچے ہیں، مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

"آیئے آیئے، اندر تشریف لے آیئے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ میرے گھر تشریف لائے۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن ہمارے ساتھ دو مہمان اور بھی ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔ اس دوران انہوں نے ڈنگو اور بنگو کو بھی نظروں میں رکھا تھا کہ کہیں وہ بھاگ نہ کھڑے ہوں، لیکن ان پر تو انسپکٹر جمشید کا نام سن کر سکتے کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ دوسرے فرزانہ ان کی طرف گڑیا تانے کھڑی تھی۔

"ہاں ہاں —— مہمانوں کو اندر لے چلیے۔ آپ جتنے بھی مہمان ساتھ لائیں، میرے لیے خوشی کا مقام ہے۔" ایس پی بچھا جا رہا تھا۔

"چلو بھئی اندر —— پہلے تم دونوں چلو۔" انسپکٹر جمشید نے ڈنگو اور بنگو کی طرف دیکھ کر کہا۔ دونوں آگے آئے اور دروازے سے اندر داخل ہوئے، جونہی ایس پی نصیر آباد کی نظر ان پر پڑی، اس کے منہ سے حیرت اور خوف کی ایک چیخ نکلی۔

اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو حیران کر دیا۔



اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید بھی اندر داخل ہو چکے تھے اور ان کے پیچھے محمود، فاروق اور فرزانہ بھی۔ ایس پی نصیر آباد ابھی بت کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"آپ تو ہمیں شیر شاہ کے پاس لے جا رہے تھے!" ڈنگو کے منہ سے نکلا۔

"اور کیا یہ سچ ہے کہ آپ انسپکٹر جمشید ہیں!"

"ہاں یہ سچ ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ میں تم لوگوں کو شیر شاہ سے ملانے کے لیے لایا ہوں، لیکن میں ایس پی صاحب کی مدد کے بغیر تم دونوں کو اس سے نہیں ملا سکتا!"

"جی کیا مطلب! کیا یہ شیر شاہ کو جانتے ہیں!" بنگو نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! بہت اچھی طرح۔ چلیے پہلے اندر چل کر بیٹھیں تو سہی!"

انسپکٹر جمشید کا لہجہ بہت خوش گوار تھا، لیکن یہ خوش گوار لہجہ محمود، فاروق اور فرزانہ کے ہوش اڑائے دے رہا تھا، وہ ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

ایس پی نصیر آباد آخر چونک پڑا اور بولا:

"آیئے ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں، پھر مجھے بتایئے گا کہ ماجرا کیا ہے، شیر شاہ کو میں جانتا ہوں، اس نے ہمارے قصبے اور قصبے میں سیر کے لیے آنے والوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے، لیکن وہ میرے ہاتھ سے ہر بار بچ جاتا ہے، میں نے اسے گرفتار کرنے

کی ہر بار پوری کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ افسوس مجھے اس کا ٹھکانا معلوم نہیں، ورنہ میں وہاں چھاپہ مار کر اسے ضرور گرفتار کر لیتا۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا، خیر فکر نہ کریں، آج ہم اسے گرفتار کر کے ہی چھوڑیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ایس پی نے انہیں بٹھانے کے بعد کمرے سے باہر جانے کا ارادہ کیا تو انسپکٹر جمشید بول پڑے:

"آپ کہاں چل دیے؟"

"آپ لوگوں کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرنے۔"

"شکریہ ہم چائے پینے کے لیے نہیں آئے۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے کچھ بھی نہ کروں۔"

"اگر خاطر تواضع ہی کرنی ہے تو مسٹر ڈنگو اور بنگو کی کیجیے۔" انسپکٹر جمشید کا لہجہ یکایک سرد ہو گیا۔

"کیا مطلب؟" ایس پی نصیر آباد چونک کر مڑا۔

"ہاں! ان کی اس سے زیادہ تواضع اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ انہیں اپنی کمر ننگی کر کے دکھا دیں۔"

"کیا!!!" کمرے میں کئی آوازیں ابھریں۔ یہ آوازیں حیرت اور خوف کی آوازیں تھیں۔ وہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایس پی کی طرف

دیکھ رہے تھے۔

اچانک اس نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی، لیکن فرزانہ کی ٹانگ چل گئی۔ وہ اوندھے منہ گرا، پھر فوراً اٹھا اور دوبارہ بھاگا۔ اس مرتبہ اس کے راستے میں فاروق آگیا۔ اس نے اچھل کر سر کی ایک ٹکر اس کے سینے میں دے ماری۔ ایس پی بری طرح ڈکرایا اور اس نے جھلاہٹ میں ایک مکا فاروق کے منہ پر دے مارا، لیکن اس کا مکا ہوا میں لہرا کر رہ گیا، اتنی دیر میں فاروق پیچھے سے اس کی ٹانگیں گھسیٹ چکا تھا اور ایک بار پھر وہ منہ کے بل فرش پر آرہا۔ اس کے ساتھ ہی ڈنگو اور بنگو نے اس پر چھلانگیں لگائیں اور اسے چھاپ بیٹھے۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کی قمیض پھاڑ ڈالی۔

تلوار کے زخم کا لمبا نشان ان کے سامنے تھا اور یہ حقیقت انہیں معلوم ہو چکی تھی کہ ایس پی نصیر آباد ہی دراصل شیر شاہ ڈاکو بھی تھا، لیکن ڈنگو اور بنگو کو اس کی تلاش کیوں تھی، یہ سوال ابھی تک سوال ہی تھا، اس سوال کا جواب انہیں بالکل معلوم نہیں تھا۔

انہوں نے دیکھا، انسپکٹر جمشید جیب سے کاغذ اور قلم نکال کر کچھ لکھنے لگے تھے، پھر انہوں نے کاغذ کو تہہ کر کے فاروق کو دیتے ہوئے کہا:

فاروق! دروازے پر دو صاحب کھڑے ہوں گے، یہ انہیں دے

آؤ۔ کھول کر پڑھنا مت۔

"جی اچھا!" فاروق نے حیرت زدہ سے انداز میں کہا۔

وہ یہ سن کر حیران رہ گئے کہ دروازے پر کون دو صاحب کھڑے ہیں۔ فاروق کاغذ لے کر چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو کی بجائے چار آدمی تھے۔ دو آدمی تو وہی تھے جو انسپکٹر جمشید کے بیان کے مطابق دروازے پر کھڑے تھے اور دو آدمیوں کو وہ اپنے ساتھ لے کر آ گئے تھے۔ یہ ٹامی سرکس کا مالک ٹامی اور رنگ ماسٹر حکیم تھے۔

وہ ٹامی اور رنگ ماسٹر کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

آخری سین

وہ سب خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، ڈنگو اور بنگو نے ابھی تک ایس پی کو قابو کیا ہوا تھا اور اس کی کمر ننگی تھی۔ اس ننگی کمر پر ٹاٹو تھی اور رنگ ماسٹر حکیم کی آنکھیں جم کر رہ گئی تھیں، سب خاموش تھے، یوں لگتا تھا جیسے راتیں گزر جائیں گی مگر کوئی کچھ نہ بولے گا۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"آپ سب لوگ حیران تو ہوں گے، لیکن اگر مسٹر ڈنگو یا بنگو مجھے اتنا بتا دیں کہ وہ اس وقت تک شیر شاہ کو کیوں تلاش کرتے رہے ہیں تو سارا معاملہ چٹکی بجاتے صاف ہو جائے گا۔"

"ہم آپ کو بتا تو چکے ہیں۔" حکیم نے جلدی سے کہا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے، آپ نے مجھے اصل بات نہیں بتائی تھی اور اس کا ثبوت میں اس طرح دے سکتا ہوں کہ مسٹر حکیم آپ اپنا بایاں ہاتھ مجھے نکال کر نہیں دکھا سکتے۔"

"کیا!!" رنگ ماسٹر حکیم کے منہ سے خوفزدہ انداز میں نکلا۔

وہ بوکھلا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"ہاں۔ ذرا ان سب لوگوں کو اپنا بایاں ہاتھ نکال کر دکھا دیں۔ آخر یہ ہاتھ ہر وقت کوٹ کی جیب ہی میں کیوں رہتا ہے۔"

حکیم کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ وہ سکتے کے عالم میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انسپکٹر جمشید کو گھور رہا تھا۔ پھر اس نے کہا:

"آپ کیا کچھ جانتے ہیں۔"

"کچھ زیادہ نہیں، لیکن میں ہر چیز کا جائزہ بڑے غور سے لیتا ہوں اور پھر حالات اور واقعات کی کڑیاں آپس میں ملاتا ہوں۔ میں نے سرکس شو کے دوران یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ آپ نے اپنا بایاں ہاتھ ایک بار بھی جیب سے نہیں نکالا جب کہ کئی بار اس کی سخت ضرورت تھی، لیکن آپ نے اس کے بغیر ہی کام چلا لیا۔"

"اُف خدا! تو کیا مجھے سب کچھ بتانا ہوگا!" حکیم کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو سنیے! میں بیان کرتا ہوں اور اب ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولوں گا، کیونکہ اب میرا کوئی جھوٹ نہیں چلے گا۔ یہ آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے، میں اس وقت بھی ٹامی سرکس کا رنگ ماسٹر تھا۔ ٹامی سرکس میری وجہ سے بہت مشہور تھا اور دھڑا دھڑ روپیہ کما رہا تھا، لیکن ٹامی سرکس کے مقابلے میں جوبلی سرکس کی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کے پاس کوئی ایسا کام کرنے والا نہیں تھا جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکتا۔ اس کے مالک نے بہت کوشش کی کہ

کسی طرح ٹامی سرکس چھوڑ کر جوبلی سرکس میں ملازمت اختیار کرلوں میں نے اس کی پیش کش ٹھکرا دی، کیونکہ مسٹر ٹامی مجھے بہت معقول تنخواہ دیتے تھے اور جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے، انہوں نے کبھی مجھے ملازم نہیں سمجھا تھا۔ میری طرف سے انکار سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پہلے تو اس نے غصہ ضبط کر کے بڑے سے بڑا لالچ دینے کی کوشش کی، اس پر بھی کام نہ بنا تو وہ بے قابو ہو گیا، اس نے مجھے دھمکی دی کہ وہ مجھے ناکارہ بنا دے گا اور یہ کہ میں ٹامی سرکس کے کام کا بھی نہیں رہوں گا۔

میں نے اس کی دھمکی کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور سرکس شو میں اپنا کام کرتا رہا، لیکن ایک رات وہ اپنا کام کر گیا۔ میں گہری نیند سو رہا تھا کہ میرے بائیں ہاتھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس نے تلوار کے ایک ہی وار سے میرا ہاتھ کلائی پر سے اڑا دیا تھا۔ میں تو چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا اور وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ جب سرکس اور پولیس کے آدمی جوبلی سرکس کی طرف دوڑے تو معلوم ہوا، وہاں خیموں کے سوا کچھ بھی نہ تھا، سب لوگ پہلے ہی وہاں سے رخصت کر دیے گئے تھے، شیر شاہ خود بھی غائب تھا۔ پولیس نے اور ہم نے بہت کوشش کی مگر ہم اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، کچھ دنوں بعد اس کا ایک خط مجھے ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ میرا ہاتھ اس کے پاس محفوظ ہے اس نے کچھ مصالحے لگا کر اسے گلنے سڑنے سے

بچا لیا ہے۔ اس لیے اگر مجھ میں عزت کی ذرا سی چنگاری بھی ہے تو اپنا ہاتھ واپس کر کے دکھائے۔ میں نے اسی روز قسم کھائی کہ اپنا ہاتھ اس سے واپس حاصل کر کے رہوں گا، جس وقت اس نے مجھ پر تلوار سے وار کیا تھا۔ وہ اوپری دھڑ سے ننگا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس نے قمیص نہیں پہنی تھی، موقع نہیں ملا تھا یا قمیص نہیں ملی تھی۔ بہرحال میرا ہاتھ کاٹ کر جب وہ مڑا تو میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے اس کی کمر پر تلوار کے ایک زخم کا نشان دیکھ لیا۔ میں اسے تلاش کرتا رہا، لیکن وہ نہ ملا۔ پھر میرے بچے جوان ہو گئے، میں نے انہیں اس کام پر لگا دیا۔ انہیں بتا دیا کہ ان کے باپ کا بایاں ہاتھ ایک دشمن کے پاس موجود ہے، وہ اس سے حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کی تلاش میں جگہ جگہ پھرنے لگے، سرکس میں کام کرتے ہوئے انہیں بلا کی اچھل کود آ گئی تھی جس کی وجہ سے یہ لڑائی بھڑائی میں بہت ماہر ہو گئے، اچھے اچھے ان سے کانپنے لگے۔ پھر ہم اس شہر میں آ گئے اور انجام کار انہوں نے شیر شاہ کو ڈھونڈ لیا۔ جو اس دوران ڈاکو بھی بن چکا تھا اور پولیس کا ایک بڑا افسر بھی۔ شاید پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے اسے کوئی بہت بڑی سفارش مل گئی ہو گی۔" یہ کہہ کر رنگ ماسٹر حکیم خاموش ہو گیا۔

"ہاں! یہ واقعی سفارشی بھرتی ہوا ہے، اس کا اقرار اس نے خود بھی کیا ہے۔ یہ ایک طرف تو نصیر آباد کا ایس پی تھا، دوسری

طرف ایک ڈاکو بھی تھا، اس نے رفتہ رفتہ پولیس چوکی کے کانسٹیبلوں کو بھی نکال نکال کر اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو بھرتی کر لیا تھا، گویا یہ پورا شہر ڈاکوؤں کے قبضے میں تھا، مجھے کئی ایک رپورٹیں موصول ہوئیں کہ نصیر آباد کی پولیس بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئی ہے، وہاں ڈاکو دندناتے پھرتے ہیں، آخر میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن مجھ سے پہلے یہاں آپ لوگ پہنچ گئے۔ اس دوران مجھ پر ایک ایسا وقت بھی آیا جب اس چالاک مجرم نے مجھے یہاں سے جانے پر مجبور کر دیا، مگر میں جا کر پھر واپس آ گیا، کیونکہ میں نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ واپس نہیں آؤں گا، گیا تو میں اس لیے بھی تھا کہ دارالحکومت سے اپنے ساتھ پوری ایک گارد لے کر آؤں گا، کیونکہ سارے قصبے کے نقلی پولیس کے آدمیوں کو جو قبضے میں کرنا تھا۔ اس وقت تمام آدمی گرفتار کیے جا چکے ہیں اور یہ اپنی مدد کے لیے ان میں سے کسی کو نہیں بلا سکتا، اگر میں ایسا نہ کرتا اور اس کے ساتھی اسے گرفتار کرتے تو یہ فوراً ہی فرار ہو جاتا۔ لیکن میں پورا پورا بندوبست کر کے چلا ہوں۔ حکیم صاحب آپ نے ابھی تک اپنا ہاتھ نہیں دکھایا۔"

"ہاں ضرور۔" یہ کہہ کر حکیم نے اپنا ہاتھ نکال کر دکھا دیا۔ اس کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر انہیں حکیم پر ترس آنے لگا، ان کا جی چاہا وہ ایس پی کے گھر سے ہاتھ تلاش کر کے اس کے بازو سے

جوڑ دیں، لیکن یہ ناممکن تھا، پندرہ بیس سال پہلے کٹا ہوا ہاتھ جڑ نہیں سکتا تھا۔

وہ دو آدمی جو ٹامی اور حکیم کو اندر لائے تھے، انہوں نے احسان علی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ اس کے بعد اس کے گھر کی تلاشی لی گئی اور کٹا ہوا ہاتھ برآمد کر لیا گیا۔ حکیم اس ہاتھ کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ مجرم اس طرح خاموش تھا جیسے اس کی زبان پر فالج گر گیا ہو۔ پھر ڈنگو کے منہ سے نکلا:

"افسوس! ہماری خواہش پوری نہ ہو سکی۔"

"کیا مطلب۔" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"ہماری خواہش تو یہ تھی کہ اس شخص کا ہاتھ بھی کلائی سے کاٹ دیتے اور یہی ارادہ لے کر ہم اسے آج تک تلاش کرتے رہے ہیں۔"

"قانون کو ہاتھ میں لینے کے بعد تم دونوں بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتے، اور تمہارے باپ کی آنکھوں میں آنسو۔ اس سے کیا فائدہ ہوتا، بہرحال تمہاری کوشش سے آج یہ شخص نہ صرف ڈاکوں کا مجرم ہے بلکہ ایک شخص کا ہاتھ کاٹ ڈالنے کا بھی مجرم ہے اور عدالت اسے پوری پوری سزا دے گی، فکر نہ کرو۔"

"فکر تو ہمیں کرنا چاہیے۔" فاروق بول اٹھا۔

"تمہیں کس بات کا فکر ہے"۔ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"اس بات کا کہ اس کیس میں ہم صرف باتیں ہی کرتے رہے ہیں، ہم نے کوئی تیر نہیں مارا، کوئی کام نہیں دکھایا، سارا کام تو آپ دکھا گئے۔ یا پھر ڈنگو اور بنگو" فاروق نے بڑے بُرے منہ بنا کر کہا۔

"نہیں خیر، یہ بات تو نہیں کہی جا سکتی۔ کام تو تم تینوں نے ضرور کیا ہے، ہاں تمہیں کچھ نمایاں کام کرنے کا موقع نہیں ملا، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں، کام حالات کے مطابق ہی کیا جا سکتا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ضرورت نہ ہو اور ہر کام میں ٹانگ اڑا دی جائے۔"

"اور ابا جان! ہماری سیر کا کیا بنے گا۔ مجھے تو اب سیر کے نام سے ڈر لگنے لگا ہے۔ جونہی ہم سیر کا نام لیتے ہیں، کوئی نہ کوئی کیس آ ٹپکتا ہے، لیکن اس مرتبہ اگر ایسا ہوا تو ہم کیس کو اس طرح پرے جھٹک دیں گے جیسے گدھے نے اپنے سر سے سینگ جھٹک دیئے تھے۔" فاروق کہتا چلا گیا۔

"کیا تم نے خود گدھے کو سینگ جھٹکتے دیکھا تھا۔" فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں۔ میں نے تو اس محاورے میں ذرا نمک مرچ لگایا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

اور اس کی بات پر سب مسکرانے لگے۔

آئندہ ناول لیجئے، ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور

انسپکٹر جمشید کے کارنامے ۱۶

کالا شہر

مصنف: اشتیاق احمد

- شہر کا نام قادر آباد تھا، لیکن انسپکٹر جمشید نے گاڑی سے اترتے ہی اسے کالا شہر کہا ۔۔۔ کیوں؟
- ٹیکسی ڈرائیور نے ان سے تین گنا کرایہ طلب کیا۔
- ایک لڑکی بے تحاشا بھاگ رہی تھی اور تین غنڈے موت کے فرشتے بن کر اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔
- نواب کون تھا، لوگ کہتے تھے، اس شہر پر صرف اس کی حکومت ہے۔
- انسپکٹر جمشید اس شہر میں کیوں گئے تھے۔
- کمرے کے فرش میں یکایک ایک چوکور خلا پیدا ہوا اور وہ چاروں خلا میں گرتے چلے گئے۔
- ایک ایسی کہانی جس کے مجرم پر ہاتھ ڈالنا انتہائی مشکل تھا۔ آپ مدتوں نہ بھلا سکیں گے۔

مراد ریٹائرڈ انسپکٹر رضوی اور موتی کے کارنامے ۵

ستار طاہر کا بچوں کے لیے نیا ناول

لکڑی کی چابی

* صدیوں پرانے قلعے کے ایک بند کمرے کی چابی موتی کو مل گئی
* اس چابی کی تلاش میں پاکستان، امریکہ اور انگلستان کے درجنوں مجرم سرگرداں تھے۔
* عیار مجرم ہر قیمت پر یہ چابی حاصل کر کے صدیوں سے دفن خزانے کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔
* موتی، مراد اور انسپکٹر رضوی نے اس لکڑی کی چابی کی جان پر کھیل کر حفاظت کی اور مجرموں کے دانت کھٹے کر دیئے۔
* ایک ایسا معرکہ جو دنیا کے بڑے بڑے مجرموں کے مقابلے میں مراد، انسپکٹر رضوی اور موتی نے انجام دیا۔

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید

کے کارنامے!

بچوں کے مشہور مصنف اشتیاق احمد کے سنسنی خیز،
ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور

ہر ماہ ۲ ناول

۱	محمود، فاروق، فرزانہ کا اغوا	۴/-	
۲	کمرہ ۴۲۰	۴/-	
۳	خون کی تحریر	۴/-	
۴	پہاڑیوں میں موت	۴/-	
۵	موت کی سرنگ	۴/-	
۶	ہنگامے کی موت	۴/-	
۷	بنک کے ڈاکو	۴/-	
۸	لوہے کا آدمی	۴/-	
۹	پُراسرار مہمان	۴/۵۰	
۱۰	جیرال کی واپسی	۴/۵۰	
۱۱	ہولناک دشمن	۴/۵۰	
۱۲	جزیروں کا ہوّا	۴/۵۰	
۱۳	قلعے کے قیدی	۴/۵۰	
۱۴	خون کا سمندر	۵/-	
۱۵	ہاتھ کی تلاش	۴/۵۰	
۱۶	کالا شہر	۴/۵۰	
۱۷	شومٹا کی لاش	۴/۵۰	
۱۸	ماموں کا ہنگامہ	۴/۵۰	

ہماری آئندہ پیشکش

یہ ناول آج ہی اپنے قریبی بک سٹال سے خریدیے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے!
مکمل سیٹ منگوانے کی صورت میں محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا۔!



مکتبہ اقراء پٹھانے بلڈنگ، ۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور